ھوالنجم

شاعر اہلبیت علامہ نجم آفندی
کی نظموں کا مجموعہ

تحقیق و تدوین

ڈاکٹر سید تقی عابدی

ھوالنجم

شاعرِ اہلبیتؑ (علامہ نجم آفندی کی نظموں کا مجموعہ)

تحقیق و تدوین

ڈاکٹر سید تقی عابدی

کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان کینٹ

ضابطہ

کتاب : مواتجم

تحقیق وتدوین اور تنقید : ڈاکٹر سید تقی عابدی

سنہ اشاعت : 2007ء

تعداد : 1000

تزئین : الکتاب گرافکس۔ملتان (پاکستان)

ایڈیشن : اوّل

باہتمام : شاکر حسین شاکر

ناشر : کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان کینٹ (پاکستان)

فون 92-61-4510444

قیمت : -/130 روپے

رَو میں ہے رخشِ عمر

نام : سیّد تقی حسن عابدی

ادبی نام : تقی عابدی

تخلص : تقی

والد کا نام : سیّد سبطِ نبی عابدی منصف (مرحوم)

والدہ کا نام : سنجیدہ بیگم (مرحومہ)

تاریخ پیدائش : یکم مارچ 1952ء

مقام پیدائش : دہلی (انڈیا)

تعلیم : ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا) ایم ایس (برطانیہ)
الیف سی اے پی (یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ)
الیف آر سی پی (کینیڈا)

پیشہ : طبابت

ذوق : شاعری اور ادبی تحقیق

شوق : مطالعہ اور تصنیف

قیام : ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور کینیڈا

شریکِ حیات : گیتی

اولاد : دو بیٹیاں (معصوما اور رویا) دو بیٹے (رضا اور مرتضیٰ)

تصانیف : شہید (1982ء) جوشِ سوزت۔ گلشنِ رویا۔ اقبالؔ کے عرفانی زاویے
انشاء اللہ خاں انشاء۔ رموزِ شاعری۔ اظہارِ حق۔ مجتہدِ نظم مرزا دبیر
۔ طالع مہر۔ سلکِ سلام دبیر۔ تجزیہ یادگارِ انیس۔ ابواب المصائب۔ ذکر
دُر باران۔ عروسِ سخن۔ مصحفِ فارسی دبیر۔ مثنویاتِ دبیر۔ کائناتِ نجم۔
روپ کنوار کماری۔ دُربارِ رسالت۔ فکرِ مطمئنہ۔ خوشۂ انجم۔ دُرِ دریائے نجف
تاثیرِ ماتم۔ جگی مالا (اردو+ہندی)۔ روشِ انقلاب۔ مصحفِ تغزل۔ حوا نجم۔
ادبی معجزہ (حضرت علی علیہ السلام کا خطبۂ بے الف کا ترجمہ)۔

زیرِ تالیف : تجزیہ شکوہ جوابِ شکوہ۔ رباعیاتِ دبیر۔ فانی شناسی۔ مصحفِ تاریخ
گوئی۔ تعشق لکھنوی۔ غالب عاشقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ۔

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

دردِ دل

کس کس سے سوال کروں؟

علامہ تجمّل آفندی نے کہا تھا:

میں خود ہوں مطمئن اے تجمّل ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

① اردو کے مشاہیر شعرائے غزل نے تجمّل کی قدر دانی کیوں نہ کی؟ (195) عمدہ اور اعلیٰ ترین غزلوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟ کیا 195ء کا آل انڈیا مشاعرہ یاد نہیں جس میں تجمّل نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا؟

② اردو کے ترقی پسند تحریک کے نمائندوں نے کیوں تجمّل کو نظر انداز کیا؟ اردو ادب میں کسان، مزدور، مزدوری اور سرمایہ داروں کے خلاف نظموں میں پہلی آواز علامہ اقبالؔ اور جوشؔ سے قبل تجمّل کے سوا کس نے بلند کی؟ اگر بقول سلیمانؔ ندوی، حسرتؔ موہانی اسلامی اور سوشلسٹ رجحان رکھ کر بیسویں صدی کے ابوذر غفاری ہو سکتے ہیں اور تحریک کے بھی پسندیدہ شاعر رہ سکتے ہیں تو تجمّل کی مسلمانی کیوں برداشت نہ ہوئی؟

③ نعت کے پرستاروں نے صدہا نعتیہ آبدار اشعار اور سولہ سے زیادہ نعتوں کو کیوں طاقِ نسیاں کے سپرد کیا؟

کیا نجم کے اس شعر میں کسی کو شک ہو سکتا ہے؟

اے نجم میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ
کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

④ کیوں افسانہ نویسوں نے عمدہ افسانہ ''چور ماموں'' نہیں پڑھا؟ کیوں ناول نگاروں نے تخلیقی شاہکار ناول ''بندۂ خدا'' کو فراموش کیا؟

شریک حال نہ ہوتی جو نجم خودداری
ہمارے غم کا فسانہ غمِ جہاں ہوتا

⑤ اردو میں کتنے شاعر ہیں جنھوں نے نجم کی طرح چھ سو سے زیادہ عمدہ رباعیاں لکھیں؟ کیوں اردو رباعیات لکھنؤ کے پی ایچ ڈی (Ph.d) کے مقالے میں نجم کا نام تک نہیں؟ جبکہ پانچ اور دس رباعی کہنے والے افراد کا ذکر آب وتاب کے ساتھ ہے۔ کیا اس قسم کے مقالوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

⑥ شاعرِ اہلِ بیتؑ کا خطاب دے کر محبانِ اہلِ بیتؑ کیوں نجم سے غافل ہو گئے؟ مولویوں، خطیبوں نے منبر سے کیوں ان کا پیغام نہیں پہنچایا؟ سلاموں، نوحوں، مرثیوں کو لے کر دوسرے انتقادی کلام کو کیوں تلف کر دیا؟ کراچی میں اتنے بڑے شاعر کے جنازے میں کیوں صرف بیس (20) پچیس (25) افراد شریک ہوئے؟

⑦ کیوں نجم کے کلام کو محبانِ اہلِ بیتؑ، گروہانِ نوحہ خوان، پرستارانِ نجم، شاگردانِ رشید، عزیز و اقربا نے انتقال کے تیس (30) برسوں میں بھی شائع نہیں کیا؟ اگرچہ نجم نے کہا تھا:

ہم نجم چار روز کے مہمان ہیں مگر
رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

⑧ اردو ادیبوں اور تنقید نگاروں نے اس بیسویں صدی کے عظیم شاعر سے کیوں غفلت برتی؟ نجم کے (12799) اشعار، (195) غزلیں، (591) رباعیات، (498) قطعات، (16) نعتیں، (81) قصائد، (107) سلام، (144) نوحے، (83) متفرقات کے علاوہ (3) مرثیے، (18) ہندی کلام کے آثار اور کئی نثری کتابیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ موجود ہیں:

آج اردوے معلی کی اشاعت کے لئے
یہ غنیمت ہے کہ نجم نکتہ داں باقی رہا

میں نے حقیقت کو پیش کیا ہے:

نجم بہتر ہے تصنع کی دلآویزی سے
تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

⑨ کانگریس، مسلم لیگ اور دوسرے قومی سیاسی عہدے داروں نے ایسے وطن دوست شاعر کو وطن کی محبت میں کیا دیا؟ جبکہ

ع : منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

کائناتِ نجم ان تمام سوالوں کا جواب رکھتی ہے۔ صرف گردشِ اوراق شرط ہے۔ شاید یہ میری نجمی عقیدت اور اُردو محبت ہو۔ یہ ایک خوشگوار حادثہ تھا جس کے فیض سے میں کائناتِ نجم کو دریافت کرسکا:

یہ بھی اک حادثہ اُردو کی محبت کا ہے نجم
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

خیر اندیش

سیّد تقی عابدی

"لہو قطرہ قطرہ" کے نام سے نجم صاحب کی غزلوں کا مجموعہ نجم صاحب کی بڑی صاحبزادی کی فرمائش پر اُن کے داماد سید محمد شاکر نے نجم صاحب کے انتقال کے چار سال بعد ۱۹۷۹ میں شائع کیا یہ اعزاز، وہ اقربا کی ہی کاوش تھی۔ نجم صاحب خود اپنی حیات میں کئی بار کہہ چکے تھے کہ میری غزلوں کا کوئی مجموعہ نہ چھپ سکا۔

سیّد انوارالحسن نقوی نبیرۂ نجم آفندی

حرفِ سپاس

میں خانوادۂ حضرت نجم آفندی کے ایک فرد کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر تقی عابدی کی اُن تمام کاوشوں اور کوششوں کو سراہنے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنی اور خانوادۂ نجم آفندی کی طرف سے تہِ دل سے شکریہ بھی ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے اکیسویں صدی میں آسمانِ علم وادب پر **"کائناتِ نجم"** کی صورت میں یہ ستارہ پھر درخشاں ہوا۔ یہ نہ صرف جنابِ نجم آفندی کی ذاتی خواہش تھی بلکہ اُن کی رحلت کے بعد میری والدہ کی بھی دیرینہ تمنا تھی کے اُن کا غیر مطبوعہ کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہو سکے۔ اس خواہش اور تمنا کی تکمیل ڈاکٹر تقی عابدی کی محنتِ شاقہ اور سعئ عظیم سے ممکن ہوئی۔ میری والدہ اور خانوادۂ نجم آفندی اُن کے لئے ہمیشہ دعا گو رہیں گے اور اس کتاب کے انتساب پر بھی ممنون رہیں گے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ نجم آفندی کے کلام کے بکھرے ہوئے اوراق کو یکجا کرنے کے علاوہ قوم وملت پر ایک اور احسانِ عظیم کیا ہے کہ قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے نجم صاحب کے مزار پر وفد کی صورت میں فاتحہ خوانی کے لئے تشریف لے گئے اور پھولوں کی چادر چڑھائی۔ پوری قوم کو اُن کے اس عمل پر شکر گزار ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی

تجمّل آفندی کا زندگی نامہ

نام — مرزا تجمل حسین

تخلص — تجمّل۔ تجمی

شہرت — تجمّل آفندی

گھریلو نام — نادر مرزا

تاریخ ولادت: رمضان 1310 ہجری مطابق 1890ء

مقامِ ولادت: اکبر آباد (آگرہ) کٹرہ حاجی حسن جو پیپل منڈی کے پیچھے واقع ہے۔

والد — مرزا عاشق حسین بزمؔ آفندی۔ معروف شاعر اپنے سگے ماموں سید اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی متوفی 1880ء کے شاگرد رہے۔ ان کی پیدائش 1860ء میں کٹرہ حاجی حسن آگرہ میں ہوئی۔ شادی آغا حسین صاحب صاحب دیوان شاعر کی بیٹی سے ہوئی۔ دوسری شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی۔ آپ بزمؔ تخلص کرتے تھے۔ معروف غزل گو اور مرثیہ گو شاعر تھے۔ بزمؔ آفندی کا انتقال 23 مارچ 1953ء کو ہوا۔

دادا — مرزا عباس تیغؔ جو مرزا نجف علی بلیغؔ کے فرزند تھے جو مرزا فصیحؔ مشہور مرثیہ گو شاعر کے حقیقی بھائی تھے۔ اسی لیے تو تجمّل آفندی نے مرزا فصیحؔ کی میراث پر فخر کرتے ہوئے فرمایا:

تجمّل میں ہوں خاک پائے مسند آرائے فصیحؔ
مدح کی دولت ملی ہے ورثۂ اجداد سے

پرداوا: مرزا ہادی علی فیض آبادی۔ مرزا ہادی علی کے تین فرزند تھے۔ (1) مرزا جعفر علی فصیح (2) مرزا نجف علی بلیغ (3) مرزا فصیح۔ ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم لکھتے ہیں۔ ''نجم آفندی کے پرداوا ہادی علی فیض آبادی حضرت عقیل ابن ابی طالب علیہ السلام کی نسل سے تھے لیکن جب ان کے بزرگ بلاد ایران میں رہنے لگے تو وہاں ''مرزا'' مشہور ہوگئے تھے۔ ہندوستان میں آمد کے بعد ان کے بزرگ شاہجہاں آباد (دہلی) میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔

معزالدین قادری اسرار و افکار میں لکھتے ہیں۔ نجم آفندی کے پرداوا مرزا ہادی علی فیض آباد کے محلّہ ''مغل پورہ'' میں رہتے تھے چنانچہ نجم آفندی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مرے بزرگوں کا اصلی وطن ہے فیض آباد
مجھے بھی شوق تھا دیکھوں میں یہ در و دیوار

اجداد: نجم آفندی کے اجداد ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے جو ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے۔

بھائی بہن: دو بھائی (1) مرزا اعجاز حسین مرحوم اکیس برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ یہ عمر میں نجم سے بڑے تھے۔

(2) مرزا سلیمان کوکب آفندی، چھوٹے بھائی جن کی صاحبزادی مشہور مرثیہ نگار شاعر باقر زیدی کی شریک حیات ہیں۔ ایک بہن شہزادی قرطیس بانو اختر جہاں کج کلاہ پروین پیدائش 1901 جو بزم آفندی کی دوسری انگریز بیوی کے بطن سے تھیں۔ پروین کج کلاہ عمدہ شاعرہ تھیں۔

شریکِ حیات: ذکیہ سلطانہ 1958ء میں گلے کی کینسر سے انتقال کرگئیں۔ کانپور کے ایک معزز گھرانے کی صاحبزادی تھیں۔

اولاد: (1) چار لڑکے۔ جن میں تین لڑکے تاجدار، کامران، عباس بچپن میں مرگئے اور اکلوتے بیٹے ہمایوں مرزا المتخلص سہیل آفندی حیات ہیں اور حیدرآباد دکن میں مقیم

ہیں۔

(2) سات لڑکیاں۔ ایک بیٹی تسنیم کا کمسنی میں انتقال ہوگیا۔ دو بیٹیاں پاکستان چلی گئیں (ایک شادی کے بعد اور ایک کی شادی پاکستان آکر ہوئی) اور چار بیٹیاں ہندوستان میں مقیم رہیں۔ جن میں سے سب سے چھوٹی بیٹی توصیف بھی نجم صاحب کے ہمراہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان آئیں جن کی شادی ان کی حیات میں پاکستان میں ہوئی۔

تعلیم و تربیت: 1۔ نجم آفندی کی اردو اور فارسی تعلیم گھر پر ہوئی۔

2- قرآن مجید اپنے چچا مرزا ہادی علی سے پڑھا

3- مفید عام اسکول آگرہ سے انگریزی میں مڈل پاس کیا۔ اس اسکول میں اردو فارسی مولوی سلامت اللہ سے اور انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر راج کمار سے پڑھی۔

4- اسرار و افکار کے دیباچہ میں معزالدین قادری لکھتے ہیں۔ ''نجم آفندی کو اردو فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی درک ہے۔ ان کی ہندی زبان میں بھی تصنیفات ملتی ہیں۔''

5- ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی دبستانِ دبیر میں لکھتے ہیں۔ نجم آفندی اردو، فارسی اور عربی اچھی جانتے ہیں اور انگریزی میں بھی اچھا درک رکھتے ہیں۔

6- ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے نجم آفندی فکر و فن میں لکھا۔ ''اردو فارسی کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن محض قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کو عربی تعلیم کا حصول سمجھ کر مالک رام اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو مغالطہ ہوا ہے۔ خود نجم آفندی نے اپنے خط میں عربی نہ پڑھ سکنے کے بارے میں لکھا ہے۔

7- اردو فارسی اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا۔ انھیں گھر پر عام طور سے انگریزی ناول کو بھی مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا گیا۔

8- نجم آفندی شمشاد حسین کے نام خط میں لکھتے ہیں ''میری تعلیم اس زمانے کے مڈل تک ہوئی مگر کم از کم انگریزی کی دو ہزار کتابیں ہر قسم کی میری نظر سے گزری ہیں۔

شکل و صورت: شکل و صورت تصویر سے ظاہر ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ نجم آفندی کا قد تقریباً پانچ فٹ تھا۔ بدن چھریرہ، رنگت سرخ و سپید تھی۔ چہرہ گول خوبصورت ناک اور باریک ہونٹ کے ساتھ بڑے کان اور سر بھی نسبتاً بڑا تھا۔ آخری عمر میں بال

بہت کم رہ گئے تھے۔ خشخشی داڑھی جو مونچھوں سے متصل تھی۔ آواز رعب دار اور
چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔

وضع اور لباس: تجمّ آفندی نستعلیق شخصیت تھے۔ وہ مشرقی روایات کے پاسدار اور اسلامی تہذیب کے
نمونہ تھے۔ جوش ملیح آبادی نے ساقی جوش نمبر میں لکھا۔ ''حضرت تجمّ آفندی جو اس
قدر دین دار و پابند وضع بزرگ ہیں کہ قہقہہ مارنے کو بھی خلافِ شرع سمجھتے ہیں۔''
تجمّ آفندی کے لباس میں سادگی تھی۔ وہ عام طور پر سفید شیروانی، سفید پاجامہ، مخمل
کی کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی کبھار کالی شیروانی پر شال اوڑھ لیتے تھے۔ پاؤں میں
معمولی سلیپر یا جوتا ہوتا۔ ہاتھ میں ہمیشہ چھڑی رکھتے تھے۔ عینک صرف حسب
ضرورت لگاتے۔

غذا و خوراک: تجمّ آفندی کم خوراک تھے۔ دیسی گھی اور گڑ سے شدید رغبت تھی۔ ان کی گھی اور گڑ کی
چاہت کی کئی داستانیں لوگوں نے بیان کی ہیں۔

سیرت و کردار: ہم تجمّ آفندی کی سیرت اور عالی کردار کے ساتھ عجز و انکساری کا مختصر خاکہ معز
الدین قادری اور ذاکر حسین فاروقی کی تحریروں سے پیش کرتے ہیں۔ اُسرار و افکار
کے دیباچہ میں معز الدین قادری نے لکھا ہے۔ ''خاندانی روایات مذہبی تعلیم و
تربیت اسلام کی عظیم شخصیتوں کے نقوشِ قدم کو اپنا راستہ بنانے کی سعی و تمنا نے ان
کو کافی متوازن، معتدل مزاج اور بنی نوع انسان کا ہمدرد بنادیا ہے۔ ان کی
آنکھوں میں بصیرت کی چمک ہے اور سنجیدگی کے نہ جانے کتنے راز ہیں۔ انھیں بنی
نوع انسان سے محبت ہے۔ شخصی اور مذہبی عقائد پر خود سختی کے ساتھ کاربند ہیں لیکن
سیرت و کردار میں کہیں بھی ''ملا پن'' یا پندار زہد'' کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا
سوانگ موجود نہیں۔ بردبار، حلیم، خوش خلق اور مصیبتوں میں مسکرانے والی شخصیت
ان کے سارے کلام سے جھلکتی ہے اور انھیں یہ کہنے کا حق ہے

میری تلاشِ راہ پہ ہنستے ہیں آج قافلے
شمع بنائی جائے گی کل میری گردِ راہ کی

بقول جوش ملیح آبادی۔ جہاں تک طبائع کا تعلق ہے، باپ بیٹے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک رنگین مزاج شاعر تھے اور ان کو رنگینی کبھی چھو کر نہیں گئی تھی۔ وہ سراپا رند تھے اور یہ سرتا پہ قدم متقی اور خشک قسم کے متقی تھے۔

دبستانِ دبیر میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی بیان کرتے ہیں: ''مروّت وضع داری، ایفائے وعدہ، حُسنِ معاشرت اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ یکساں برتاؤ آپ کے کردار کی وہ خوبیاں ہیں جو ہر شخص کے دل میں جگہ پیدا کر لیتی ہیں۔ تجمّل صاحب نے اپنی زندگی کے جو اصول بنائے تھے وہ تا حیات ان پر کاربند رہے اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے انھوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور ان کی کامیاب زندگی ''قابلِ رشک موت'' کی ضامن بن گئی۔ بقول خود:

کچھ شعر جو منقبت میں کہہ لاتا ہے
اس خواب سے اپنے دل کو بہلاتا ہے
موزوں ترے کردار پہ بھی ہے یہ خطاب
تو شاعرِ اہل بیت کہلاتا ہے

شغل و ملازمت:

1- ریلوے کے محکمہ میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس وقت تجمّل کی عمر بیس سال تھی۔

2- پھر دہلی میں ملازمت کی۔

3- کالکا اسٹیشن اور غازی پور اسٹیشن پر کچھ عرصہ ملازم ہوئے۔

4- تحریک ترکِ موالات سے متاثر ہو کر ریلوے کی ملازمت ترک کر دی اور تلاشِ معاش میں ردولی پہنچے اور کچھ عرصہ کاشتکاری کی۔

5- جونیئر پرنس معظم جاہ شجیع کے دربار سے منسلک ہوئے۔ ان کے سپرد پرنس کے کلام کی اصلاح تھی۔ تنخواہ بھی اس کام کی پاتے تھے۔ تجمّل کی ماہانہ تنخواہ دو سو روپے ماہوار تھی۔

6- دربار سے علیحدہ ہو کر مالی پریشانیوں میں بسر کی اور اپنی خود داری کو نبھانے اور پیٹ

کی آگ بجھانے کے لیے چھتہ بازار حیدرآباد میں جوتوں کی دکان تک کھولی۔

تف بر تو اے چرخِ پیر کہ شاعرِ اہلِ بیت کو اتنی بڑی قوم تنگ دستی میں سہارا نہ دے سکی جبکہ تمام قوم اور تاجر اُن کے کلام سے روحانی اور اقتصادی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اسی لیے تو اپنے خطوط میں اس طرح گلہ کیا "آج ہندوستان میں تبت سے راس کماری تک میرے نوحے پڑھے جا رہے ہیں لیکن مالی فائدہ دوسرے اٹھا رہے ہیں" 'کاروانِ ماتم' لاہور والوں نے میری اجازت و اطلاع کے بغیر شائع کر لی ہے۔ لکھا تو جواب تک نہیں دیتے۔ یہ قدر دانی ہو رہی ہے۔ ہم تکلیف اٹھا رہے ہیں اور یہ نفع کما رہے ہیں۔"

شاعری کا آغاز: ۱۲ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ ابتدا غزل گوئی سے کی۔ شاہ نیاز وارثی کی غزل پر مصرعے لگائے

زہے عزّو جلالی بو ترابی فخرِ انسانی
علیِ مرتضیٰ مشکل کشائی شیرِ یزدانی

پہلا مشاعرہ: جس مشاعرے سے نجم کی شاعری کا تعارف ہوا وہ خود ان کے گھر کے سامنے منعقد کیا گیا تھا جس میں اکابر شعرا نے شرکت کی تھی۔ نجم کی غزل کا مطلع تھا:

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے
قبرِ عاشق اور ایک میلی سی چادر دیکھتے

شاگردی: شاعری کے آغاز میں اپنے والد بزم آفندی کی شاگردی کی لیکن بہت جلد ہی اصلاح سے بے نیاز ہو گئے۔

صحبتِ اساتذہ: نجم آفندی کو گھریلو ماحول کے علاوہ اپنے دہلی کے قیام کے دوران نواب سائل دہلوی، بے خود دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحر، منشی امیر اللہ تسلیم، شوکت علی میرٹھی، عبدالرؤف عشرت، ناصر علی خاں بچھلی شہری اور وقار کانپوری جیسے شعرا کی صحبت حاصل تھی۔ انھیں اساتذہ نے نجم کی شعری صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کہیں اس نوجوان شاعر کو صدر مشاعرہ بنایا تو کہیں راجہ چندر اول نے ان کی شاہکار نظم کو (1800) سو روپیوں

میں خرید کر یہ رقم یتیم خانہ کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ کبھی محفلِ مقاصدہ میں صفی لکھنوی کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ "تجم صاحب ہم نے بائیس (22) سال اس محفل میں چراغ جلایا ہے اب آپ کی باری ہے۔"

خطاب: ناصر الملّت نے تجم آفندی کو "شاعرِ اہلبیتؑ" کا خطاب دیا جو تجم آفندی کے مسلسل سلام اور قصیدہ نگاری کا اثر تھا۔

یہاں یہ بات بھی خارج از محل نہیں کہ تجم آفندی کے دادا کے بھائی مرزا فصیح کو خلافت عثمانیہ کی جانب سے آفندی خطاب نعمت اللہ اور حاجیوں کی خدمت کرنے پر دیا گیا تھا جو نسلاً بعد نسل استعمال ہو سکتا تھا۔

ہم عصر شعراء: حالی، اکبر الہ آبادی، اقبال، سائل دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، نسیم، حسرت موہانی، صفی لکھنوی، مرزا اوج، دولھا صاحب عروج، مرزا ثاقب، آرزو لکھنوی وغیرہ بزرگ عمر ہم عصر شعرا تھے جب کہ ان کے ہم عمر شعرا میں فانی، جوش، صدق جائسی، یگانہ، سیماب، مہذب لکھنوی، نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، سید آل رضا وغیرہ شامل تھے۔

تلامذہ: تجم آفندی کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خود انھوں نے جو فہرست جلیس ترمذی کو روانہ کی تھی اس میں (69) نام تھے۔ وہ بعد میں بڑھ کر (72) ہو گئی، اور کچھ اس طرح ہے جسے ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے تجم آفندی فکر و فن میں نقل کیا ہے۔ رعنا اکبر آبادی، جعفر مہدی، رزم رودلوی، صفدر حسین کاظمی، عبدالسعید رشک، عابد مرحوم، وزارت علی، علی انجم اکبر آبادی، مرزا عبدالکریم مضطر، کوکب اکبر آبادی، جلیس ترمذی، انتظام الحسنین، خاور نوری، سعید شہیدی، مرزا عادل، ساجد رضوی، شاہد حیدری، عازم رضوی، قائم جعفری، عباس عابدی، خورشید جنیدی، باقر منظور، طاہر عابدی، خواجہ ضمیر، کاوش حیدری، تجو قمر، راحت عزمی، تصور کرت پوری، غباس زاہد، شہید یار جنگ، ہشیار جنگ، ڈاکٹر اختر احمد، تبسم نظامی، طالب رزاقی، حرماں خیر آبادی، عاصم جمیل، ساحر نجمی، سعید السائمہ، زیبا رودلوی، پرنس معظم جاہ شجیع، ہاشم جاں بہادر، اختر زیدی، حسن مدنی، اثر غوری، کاظم رشک، شاغل حیدر آبادی، صمیم

حیدر، محبؔ جاورہ، صادق نقوی، سوزؔ رضا ترمیم، تقیؔ عسکری، اقبالؔ عابدی، سید جعفر حسنین، زاہدؔ رضوی، ظہیرؔ جعفری، آغا ہاجرؔ، باذلؔ عباس ضیغم، سازؔ، ثاقبؔ، سعادت نظرؔ، عبدالحیؔ خاں، شارقؔ، بانو سید پوری، نظیرؔ سیہوری، عقیلؔ نجمی، سہیلؔ آفندی، روپؔ کماری، بیدارؔ نجفی اور وفا ملک پوری وغیرہ۔

ڈاکٹر نواز حسن زیدی لکھتے ہیں کہ تلامذہ کی اصلاح کے وقت نجم آفندی کے ہاں وہی جذبہ کارفرما ہے جسے عشقِ اہلِ بیتؑ کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ تلامذہ کے کلام کی اصلاح کے لیے باقاعدہ اصول وضع کر رکھے تھے۔ شاگردوں کے خطوط کے جواب میں لکھتے ہیں۔ ’’مجھے امید نہیں کہ جلد تمھارا کلام دیکھ کر بھیج سکوں گا۔ از روئے انصاف سلسلہ وار دیکھتا ہوں‘‘ آج کل چار طرف سے پاکستان اور ہندوستان سے اصلاح کا کلام آرہا ہے۔ سر اٹھانے کی مہلت نہیں۔ دماغ بھی کام دیتا ہے تو ہاتھ کانپتا ہے کس کس کو منع کروں اور کیسے ممکن ہے مدحِ اہلِ بیتؑ کا مسئلہ ہے۔

مدتِ مشقِ سخن: تقریباً ستر (70) سال

مسافرت برائے شاعری: دہلی، کانپور، لکھنؤ، حیدرآباد، کراچی، کلکتہ، بنارس، لاہور ہی نہیں بلکہ دور دراز کے چھوٹے مقامات پر بھی تبلیغ پیامِ اہلِ بیتؑ میں مشغول رہے۔ چنانچہ فیض آباد، بریلی، بارہ بنکی، سیتاپور، بھرت پور، اجین، مدراس اور بلرام وغیرہ کے لوگ بھی موصوف کے کلام کے دلدادہ رہے۔

زیارت عتبات عالیہ: 1950ء اگست میں زیارتوں کے لئے عراق گئے اور مختلف مقاماتِ مقدسہ پر حاضری دی اور اپنے تاثرات کو منظوم لکھ کر ’’تاثراتِ زیارت‘‘ کے عنوان سے شائع کیا۔

تصنیفات: راقم کو کائناتِ نجم آفندی مرتب کرتے ہوئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نجم آفندی کی تصانیف تقریباً عنقا ہیں۔ نجم آفندی کی چالیس (40) سے زیادہ تصانیف شائع ہوئیں۔ سب سے پہلی تصنیف ان کے کلام کا مجموعہ 1917 میں اور آخری تصنیف

''لہو قطرہ قطرہ'' ان کے انتقال کے چار سال بعد 1979ء میں شائع ہوا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے لکھا ہے کہ نجم آفندی نے حیات میں چند تصانیف مرتب کی تھیں مثلاً ''گلدستہ نعت'' ''مذہبی رباعیات'' ''قومی اور مذہبی نظموں کا مجموعہ'' ''خودنوشت سوانح حیات'' جو نامکمل رہ گئی تھی جو کبھی شائع نہ ہوئیں۔ نیز نجم کے مضامین کا کوئی مجموعہ بھی ترتیب نہیں دیا گیا۔

نجم مرحوم کی تصانیف کی فہرست جو ضمیر اختر نقوی نے مرتب کی ہے یہاں پیش کی جارہی ہے۔ باضافہ چند تصانیف جو بعد میں شائع کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.1	پھولوں کا ہار	1917ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	پہلا مجموعہ کلام۔ادبی، اخلاقی قومی نظموں کا مجموعہ وہ نظمیں جو شیعہ کانفرنس میں پڑھی گئی تھیں۔
.2	قصائد نجم	1943ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	رباعیات (32) قصائد اور نظمیں (25)
.3	تہذیب سوّت	1943ء	تاج پریس، یوسف آباد، حیدرآباد	رباعیات (140)
.4	اشاراتِ غم حصہ اول	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (32) نوحے
.5	اشاراتِ غم حصہ دوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (33) نوحے
.6	اشاراتِ غم حصہ سوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (21) نوحے
.7	کربل کی آہ	ــــــــ	کتب خانہ اثنا عشری، لکھنؤ	جدید نوحہ جات (9) نوحے
.8	آیاتِ ماتم	1361ھ	نظامی پریس، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض
.9	تصوراتِ غم	1943ء	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
10.	کربل نگری	1361ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج لکھنؤ	سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی پر لکھی گئی نظم (اردو۔ ہندی)
11.	اسلام پوتھی	1380ھ	امامیہ مشن لکھنؤ	طویل مثنوی، آغاز اسلام سے ہجرت حبشہ تک (اردو۔ ہندی)
12.	فتح مبین	1943ء	نظامی پریس لکھنؤ	ایک مرثیہ۔ 5 سلام، 9 رباعیات
13.	بیاض تجم	1950ء	مکتبہ سلطانی، بمبئی	نوحہ جات، (حصہ اول، 53 نوحے، حصہ دوم 81 نوحے)
14.	شاعر اہل بیت جیل میں	1939ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	قومی نظموں اور قطعات کا مجموعہ
15.	حسینی سنسار	1364ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	نوحہ جات
16.	کاروان ماتم	ـــــ	کتب خانہ اثنا عشری لاہور	(54) نوحے اور سلام
17.	پریم بھگتی	ـــــ	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	ہندی نظموں کا مجموعہ، اردو رسم الخط میں
18.	دارالسلام	ـــــ	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	جدید رنگ کے سلام
19.	تاثرات زیارت	1950ء	الکٹرک پریس، حیدر آباد	زیارت سے متعلق منظوم خراج عقیدت

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
20.	نصاب دینیات	1364ھ	مطبع حیدری، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر دینی احکامات (نثر)
21.	شہیدوں کی باتیں	1952ء	رضا کار بک ڈپو، لاہور	کربلا والوں کے اقوال اور کارنامے (نثر)
22.	حسینؑ اور ہندوستان		مکتبہ ناصری گولہ گنج لکھنؤ	ہندوستان کا امام حسینؑ سے روحانی تعلق (نثر)
23.	لغات المذہب	1961ء	رضا کار بک ڈپو، لاہور	ایک ہزار مذہبی الفاظ پر مشتمل لغت (نثر)
24.	چور اماموں	1349ھ	زاویہ ادب، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر اخلاقی افسانہ (نثر)
25.	چاند کی بیٹی	—	—	—(نثر)
26.	پھول مالا	—	—	—(نثر)
27.	معراج فکر	1959ء	رضا کار بک ڈپو، لاہور	مرثیہ
28.	اسرار وافکار	1971ء	ادارۂ قدر ادب، حیدرآباد	چار سو رباعیات وقطعات
29.	قصائد نجم	1372ھ	تاج پریس، حیدرآباد	سولہ (16) قصائد کا مجموعہ
30.	جانِ کربلا	1960ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے+سلام)
31.	معرکۂ غم		مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے+سلام)
32.	دکھ کا ساگر		مکتبہ ناصری گولہ گنج لکھنؤ	(نوحے+سلام)

تفصیلات	مطبع	سن طباعت	نام کتاب	نمبر شمار
نوحے اور سلام	عزادار بک ڈپو	ـــــ	کاروانِ عزا	.33
ـــــ (نثر)	ـــــ	ـــــ	ترقی کی برکتیں	.34
قصائد	مطبوعہ شمسی پریس، آگرہ	ـــــ	قصاید قدسی	.35
نظموں کا مجموعہ	دکن اُردو اکادمی	1364ھ	ستارے	.36
ایک مذہبی ناول (نثر)	کاظمی پرنٹنگ پریس حیدرآباد	1969ء	بندۂ خدا	.37
ـــــ (نثر)	دائرہ الکٹرک پریس، حیدرآباد	ـــــ	نفس اللہ	.38
ـــــ (نثری کتاب)	ـــــ	ـــــ	ترقی پسندوں کے نام	.39
(145) رباعیات	امامیہ کتب خانہ لاہور	ـــــ	رباعیات نجم آفندی	.40
قصائد	ـــــ	ـــــ	پنجتنی قصائد (غیر مطبوعہ)	.41
(30) رباعیات	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد	1976ء	رباعیات	.42
پچاس منتخب غزلوں کا مجموعہ	پرنٹنگ محل، ناظم آباد کراچی	فروری 1979ء	لہو قطرہ قطرہ	.43

وطن پرستی اور انگریز نفرت: سچ تو یہ ہے کہ برصغیر نے علامہ نجم آفندی کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور آزادی کے بعد ع: منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔

وطن دوستی انگریز نفرت اور قومی محبت نجم آفندی کے ریشہ ریشہ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ذیل میں چند واقعات اور حکایات ہمارے دعوئی کے ثبوت ہیں۔

1. ابتدائی عمر میں جب اسکول میں کسی ہندو لڑکے سے جھگڑا ہونے کے بعد ان کے ہیڈ ماسٹر راج کمار کے جملہ "تم دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے؟" نے فوراً

انگریزوں کے خلاف متحد ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اپنی خودنوشت میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "میرے دل نے آواز دی کہ تیسرے سے مراد انگریز ہے جس کی غلامی کی صعوبتیں ہم برداشت کر رہے ہیں لیکن اس کو مار بھگانے کی جسارت نہیں کرتے۔"

2. نجم آفندی کی کھدر پوشی سے تنگ آ کر ان کے انگریز افسر نے ان کا تبادلہ سزا کے طور پر آسنسول کر دیا۔ چنانچہ بعد میں نجم نے تحریک ترکِ موالات سے متاثر ہو کر سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کے لئے استعفےٰ دے دیا۔

3. انگریزوں کے استعمار سے بیزار ہو کر زمانۂ طالب علمی میں ایک چھوٹی سی انجمن بنائی جس کا خفیہ ایجنڈا انگریزوں سے ان ہی کے ہتھیاروں سے مقابلہ اور قومی ملی یکجہتی تھا۔ اس انجمن کے ممبر ایک خاص قسم کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ انجمن رشتوں کے بھائی کی سازش سے ختم ہوگئی۔

4. سرکاری ملازمت سے علیحدگی کے بعد قومی اور مذہبی رجحان نے تقویت پائی چنانچہ ایک طویل پچیس (25) بند کی نظم "دُرِ یتیم" لکھی جو "پھولوں کا ہار" مجموعۂ کلام میں شامل ہے اور اس نظم کے ساتھ یہ نوٹ بھی لکھا ہے کہ یہ وہی نظم ہے جس نے کانفرنس کے آٹھویں اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں حشر برپا کر دیا تھا اور جس پر سید ابو جعفر صاحب نے ساڑھے چار ہزار روپے نچھاور کر دیے تھے۔

5. نجم آفندی نے اپنی تصنیف "ترقی کی برکتیں" میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے لکھا۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں قوموں کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے طاقت ور بازوؤں کا صحیح مصرف کریں اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے فساد روک کر ملک کی سب سے بڑی خدمت کریں۔

6. نجم آفندی جلیس ترمذی کے خط میں لکھتے ہیں: ہندو قوم کے افراد نے گاندھی جی کو ختم کر کے دنیا کو یہ بتا دیا ہے کہ ہندوستانی ذہنیت کہاں تک پست ہو سکتی ہے۔

7. نجم آفندی کانگریسی تھے اور اسی لئے کانگریسی مشاعرے بھی کروائے۔ ایک مشاعرے

میں تو ردیف ''کھدر'' رکھی گئی۔ انگریز دشمنی اور وطن دوستی نے نجم کو کانگریسی بنا دیا اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں۔ ''ہم نے ایسے بھی مشاعرے کیے ہیں جن کا مقصد حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ ایسے مشاعروں کو کانگریسی مشاعروں کا نام و جاتا تھا۔ میرے ایک دوست برہم سروپ خار میرٹھی میری طرح پکے کانگریسی تھے۔

8. ترقی کی برکتیں میں لکھتے ہیں: ''ہندوستان کی بدقسمتی سے ہندو مسلم اختلاف پیدا ہوا تضاد بڑھنے لگا اور آج وہ نوبت آئی کہ مسلم لیگ کو پاکستان کی تجویز پیش کرنی پڑی۔

صدمات: 1. سرکاری نوکری سے استعفیٰ کے بعد مالی بحران سے دوچار رہے۔ ماہنامہ ''مشورہ جاری کیا لیکن مالی حالت بدتر ہوگئی۔

2. پرنس معظم جاہ کے شاہانہ مزاج کو برداشت نہ کر سکے اور نوکری ترک کردی۔ کچھ دنوں کی فارغ البالی پھر مالی بحران میں تبدیل ہوگئی۔

3. 1953ء میں والد کا انتقال ہوگیا۔

4. 1958ء میں اہلیہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔

5. برادر خرد کوکب آفندی اور دو بیٹیوں کا پاکستان میں ہمیشہ کے لئے آباد ہونا۔

علالت اور مرض الموت: نجم آفندی کو پرنس معظم جاہ شجیع کی دربارداری نے نیند کی گولیوں کا محتاج کر دیا تھا، چنانچہ آخری عمر تک ان زہریلی دواؤں کا اثر باقی رہا۔ اعصاب میں تنا کم خوابی، لاغری اور ضعف کے علاوہ آخری عمر کے حصے میں معدہ، جگر، قلب کی بیماریاں اور رعشہ و ثقل سماعت سے دوچار رہے۔ آخری عمر جو پاکستان میں گزری عموماً بہت کم باہر نکلتے تھے اور زیادہ تر بستر پر لیٹے رہتے تھے۔

پاکستان میں: 1. نجم آفندی پہلی بار اپریل 1971ء میں دہلی سے بذریعہ ریل گاڑی لاہور پہنچے او ۱۴دن قیام کے بعد کراچی آگئے۔ ایک مرتبہ پھر لاہور جا کر آخری وقت تک کراچی میں مقیم رہے۔ نجم صاحب محفل شعر و سخن، مشاعروں مسالموں، مقاصدوں او مجلسوں میں شرکت فرماتے رہے۔ پاکستان میں تقریباً ہر بڑے اور معروف ادیب،

اگست ۱۹۷۳ء تک روزانہ اکیلے ٹہلنے نکلتے تھے اور کافی دیر ٹہلا کرتے تھے

شاعر اور خطیب سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کا کلام روزناموں، رسالوں، جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں قیام کے دوران بعض اوقات اپنی یاد داشتیں ایک ڈائری میں بھی مرتب کیں جو ان کی ملاقاتوں اور محفلوں کی عمدہ یادگاریں ہیں۔

وفات : تاریخ 17/ذی الحجہ 1395 ہجری مطابق 21/دسمبر 1975ء

وقت : ½ 9 بجے صبح

مقام : کراچی

دن : اتوار

غسل میت : وصیت کے مطابق مکان پر ہوا

نماز میت : بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں پڑھائی گئی

دفن : سخی حسن دربار کے قبرستان واقع نارتھ ناظم آباد ہوا۔ شفیق اکبر آبادی نے تلقین پڑھائی۔ سوئم کی مجلس رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں ہوئی۔ سید ضمیر اختر نقوی صاحب نے مجلس پڑھی۔ جنازہ میں صرف پچیس تیس افراد نے شرکت کی۔

قطعات، اشعار اور مصرعہ تاریخ وفات

1. جناب نسیم امروہوی:

لکھ دو نسیم باکمال قبر پہ سالِ انتقال
بقعۂ پاک محوِ خواب شاعرِ اہلِ بیت نجم

1975ء

2. جناب رئیس امروہوی:

فراقِ نجم آفندی مرحوم
"غروب انجم نجم" اے قلم لکھ

1395ھ

3. جناب فیض بھرت پوری:

رحلت شاعر فنا فی اللہ
نجم آفندی اکبر آبادی

1975ء

4. جناب ساحر لکھنوی

سال رحلت کے لئے قبر پہ لکھ دو ساحر
نجم ہے دامنِ مدفن میں ستارے کی طرح

1395ھ

5. جناب کسریٰ منہاس:

زیرک دانہ نکتہ داں شاعر

1395ھ

شاعر نکتہ داں گرامی تبار

1975ء

6. جناب نیساں اکبر آبادی

تذکرۂ اہلِ بیت جس کا تھا شغل سخن
خلد میں وہ آگیا شاعرِ شیریں نوا

1975ء

7. جناب خلش پیر اصحابی:

الف سے الم کے خلش اب تو یوں
ہے لکھا غم نجم دائم رہا

1395ھ = 1394 + 1

8. جناب باقر امانت خوانی:

اس طرح باقر نے کھینچا منظر سالِ وفات
اب فلک سے شاعری کے نجم ٹوٹا جلوہ ریز

1975ء

9. پروفیسر فیضی:

بتائید الٰہی یہ شرف فیضی انہی کا تھا
عزادارِ شہید کربلا تھے نجم آفندی

1975ء

10. جناب شائق زیدی:

رہے وہ اے شائق یہ تجمل — شاعرِ اہل بیت جہاں میں
پڑھتے ہوئے آیاتِ ماتم — نجم گئے ہیں باغِ جناں میں

1395 ہجری

11. جناب فضل الدین فدا

تعزیت نامہ پاسدار اہل حق

1395 ہجری

وفاتِ حسرت آیات جلیل القدر

1975ء

مربیِ کرم خسرو اقلیمِ دانش

1975ء

برگزیدۂ رحمٰن نازشِ ملت نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ

1975ء

وحید زماں بلند آستاں نور اللہ مرقدہ

1395 ہجری

یہ صدمہ کس قدر غم آفریں ہے — نظر بے چین دل اندوہ گیں ہے
فدا لکھ نجم کی تاریخ رحلت — بلا شک ساکنِ خلدِ بریں ہے

1395 ہجری

تعداد کُل کلام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ

علامہ نجم آفندی

نمبر شمار	صنفِ سخن	تعداد	تعداد اشعار
.1	غزلیں	195	1932
.2	رباعیات	591	1182
.3	قطعات	498	1001
.4	نعت	16	304
.5	قصاید	81	2519
.6	سلام	107	1375
.7	مراثی	3 (209 بند)	627
.8	نوحے	144	2237
.9	تاثیر زیارات	10	128
.10	متفرقات	83	1036
.11	ہندی کلام	18	458
			کل اشعار = (12799)

ڈاکٹر سید تقی عابدی

سرمایہ داری جبر کے خلاف پہلی آواز

انسانی جبلت انسان کے وجود سے موجود ہے جو کئی ہزاروں اور لاکھوں برس پرانی ہے اور یہی پرانی فطرت ہمارے خون یعنی genes میں موجود ہے جبکہ انسانی تہذیب اور تمدن صرف چار پانچ ہزار سال کی انسانی قدروں کا ثمر ہے۔ انسان کی حیوانی صفات پر انسانی اقدار کی ملمع نگاری ہوئی ہے۔ چنانچہ ہر دور میں حیوان صفت افراد کا موجود رہنا تعجب کی بات نہیں۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے ادیان اور تہذیبی رجحان آئے ان سب کی قدر مشترک انسانی اقدار کی تعلیم، تجدید اور تشہیر ہی رہی۔ اور آج کی جو تمدنِ بزرگ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے انہی صحت مند ذہنوں کی طرز زندگی کی دین ہے۔ حیوانی جبلت یا قانون فطرت ہمیشہ طاقتور و قدرت مند اور قوی ہیکل حیوان کے حق میں فیصلہ سناتی ہے۔ جہاں ع: ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔ سرمایہ داری، زمینداری، حکمرانی اور کمزوروں، ضعیفوں کی حق تلفی کی داستان، خونی رنگ سے رنگی ہوئی ہے۔ زمانے کے انقلابات نے گاہے اور بعضے مقامات پر ان طاغوتی اور اہرمن طاقتوں کو کچل دینے کی کامیاب کوششیں بھی کی ہیں جہاں گردن سے شمشیریں توڑ دی گئیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ حیوانی شہوتیں تمام فنا ہوگئی ہوں، بلکہ آج کے اس مہذب ترین دور میں بھی ہمیں حیوانی چہرے انسانی نقاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ آج بھی ظالم کے حوالے عدالت کا حساب کیا جاتا ہے اور آج بھی بلبل کی حفاظت کے لیے خوں خوار عقاب کو نگہبان کیا جاتا ہے۔ انہی مشاہدوں، تجربوں اور تلخ سماجی حقائق کا اثر جب بیدار ذہنوں پر پڑتا ہے تو تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ چنانچہ برصغیر کی ادبی تحریک جو ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اس کی ساخت اور بافت میں یہی قدریں کارفرما تھیں۔ اگرچہ یہ تحریک صرف چند مٹھی بھر روشن فکروں نے بنائی لیکن بہت جلد بقول ساحر:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اگرچہ ترقی پسند تحریک بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں منظر عام پر آئی لیکن انہی اقدار کو جو آگے چل کر تحریک کے تحریکی عناصر بن گئے، اردو شعر و ادب کی بعض اہم شخصیتوں نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا جن میں بعض کے نام سے لوگ واقف ہیں۔ بعض نام گمنامی کے سپرد کردیے گئے۔ اسے بھی اردو ادب کی ستم ظریفی کہیے کہ عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی علامہ نجم آفندی کے اُس کلام سے بے خبر ہیں جو ترقی پسند اقدار سے مالا مال ہے۔ اگر تحریک اقدار کی نشوونما کا نام ہے تو اس میں نجم آفندی کا نام سرفہرست ہونا چاہیے۔ لیکن اگر تحریک ایک گروہ یا کسی خاص ذہنیت کے محاصرہ کا نام ہے تو اس میں نجم کا شامل نہ ہونا اس لیے مستحسن ہے کہ اس مکتب میں عدل کے سوا دوسرے مطالب کی پرورش کی جاتی ہے۔ جبکہ عدل اور انصاف انسانی تہذیب کا سب سے اعلیٰ ترین جوہر ہے۔

"اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" میں جناب خلیل الرحمن اعظمی نے تقریباً ہر چھوٹے بڑے ادیب اور شاعر کا تذکرہ کیا لیکن نجم کو طاق نسیاں کے سپرد کردیا۔ اگر حق کی بات کی جائے تو تحریکی اقدار کو جس طرح نجم نے بیسویں صدی کے اوائل میں پیش کیا، سوائے حسرت موہانی کے ہمارے درمیان کوئی تیسری شخصیت نظر نہیں آتی۔ کسان، مزدور، مزدوری، سرمایہ داری وغیرہ پر علامہ اقبالؔ اور جوشؔ ملیح آبادی کی نظمیں اور اشعار 1920ء کے بعد کی یادگاریں ہیں جبکہ علامہ نجم آفندی نے ان نکات کو بہت پہلے پیش کردیا تھا۔ جہاں تک الطاف حسین حالیؔ کا مقدمہ اردو شعر و شاعری پر عدالتِ ادب عالیہ میں دائر کیا گیا ملتا ہے، اس میں مولانا حالیؔ نے اخلاق کردار اور شاعری برائے ادب کے ساتھ ساتھ شاعری برائے ہدف کا سبق دیا ہے لیکن اس میں سرمایہ داری کے خلاف یا منجمد عقیدتی ذہن کے خلاف کوئی علاج کا نسخہ نہیں لکھا گیا پھر بھی تحریکی منازل کے ابتدائی زینوں میں حالیؔ کی چند نصائح کو اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان تمام نکات پر روشنی ڈالی نہیں جاسکتی جس کی تہہ میں وہ عوامل نظر آتے ہیں جن کے باعث نجم شناسی سے ۔۔۔ اختیار کی گئی، لیکن ایک واضح بات یہ ضرور ہے کہ نجم سوشلسٹ ہونے کے

ساتھ ساتھ اسلامی اقدار کے مالک تھے۔ انھیں اسلامی نظام میں وہ تمام چیزیں دستیاب تھیں جن کے سہارے وہ ایک مہذب، متمدن اور مطمئن زندگی گزار سکیں۔ تجمّل کی شاعری اور دیگر نثری کاوشوں میں اسلامی معاشرہ کی ان کمزوریوں سے نقاب کشی کی گئی ہے جہاں حق کشی اسلامی لبادہ میں کی گئی وہ واعظ اور مولوی اور اسلام نما مرتدوں سے بدظن تھے اور اسے دین فطرت کے مغائر جانتے تھے۔ شاید تجمّل کا یہ انداز اس طرح سے کسی اور شاعر اور ادیب کو نصیب نہ ہوا ہو۔ وہ جہاں سرمایہ داری، حق تلفی اور استعمار کے خلاف تھے، وہیں پر اگر کوئی نیک صالح شخص جو اپنے عقیدہ میں پکا ہو، اس کی تعریف بھی کرتے تھے۔ چناں چہ تجمّل کا مذہبی ناول ''بندۂ خدا'' اس کا زندہ ثبوت ہے۔

تجمّل کی شاعری کا سفر دوسرے ترقی پسند مشاہیر شعرا سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحرلدھیانوی، مجازؔ اور فیضؔ کی طرح رومان سے انقلاب یا انقلاب سے رومان کی جانب نہیں ہے بلکہ رومان اور انقلاب کا امتزاج ان کے پاس شروع ہی سے ملتا ہے جس کو علامہ اقبالؔ کے نقش قدم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی تجمّل کا فلسفۂ حیات بھی ہے۔ کہتے ہیں: رباعی

سب فلسفۂ حیات کہہ دیتا ہوں   اک حرف میں کائنات کہہ دیتا ہوں
شاعر ہوں مجھے دماغ تفصیل کہاں   سو بات کی ایک بات کہہ دیتا ہوں

اس تحریر میں ہم طوالت کا خیال کرتے ہوئے صرف دو موضوعات پر کچھ اشعار پیش کریں گے جو مشتے نمونہ از خروار کے مصداق ہوگا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں غریب اور امیر، حاکم اور محکوم، سرمایہ دار اور مزدور کا فاصلہ ندی کے دو کناروں کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ ایک طرف غریب روٹی، کپڑا اور مکان کے محتاج تھے تو امیر ان تمام لوازمات سے لدے ہوئے تھے۔ احساسات کی بارود کا ڈھیر، روزمرہ کے واقعات، مشاہدات اور تجربات سے صرف ایک چنگاری کا منتظر تھا۔ ایسے وقت میں تجمّل آفندی نے ایک طرف ایک مخفیانہ انجمن بنا کر بدیسی سامراجی انگریزی قوتوں کے خلاف مہم چلائی، کھدر پوشی کے الزام میں نوکری سے کنارہ کشی کی تو دوسری طرف مزدور کی آواز بن گئے۔ روزناموں، رسالوں، جلسوں اور جلوسوں میں ان کے اشعار دھماکے کرنے لگے۔ چند رباعیات مزدور پر سنیے اور انصاف سے بتائیے کہ اس دور میں کسی اور شاعر نے یہ لہجہ اختیار کیا۔

رباعی

جب لطفِ حیات میں کمی پاتا ہے | جب شدتِ آرام سے تھک جاتا ہے
منعم تجھے اس وقت بھی بھولے سے کبھی | مزدور کی محنت کا خیال آتا ہے

رباعی

مزدور کی زحمتوں سے نسبت بھی نہ ہو | محنت کیسی خیال محنت بھی نہ ہو
ان کا حق کیا ہے دولتِ دنیا پر | جن کو کبھی سوچنے کی زحمت بھی نہ ہو

نجم مزدوری کو غلامی کی بہ نسبت عظیم قدر جانتے ہیں:

رباعی

آزاد کو اک قید ہے فغفوری بھی | ہے بارِ گراں قبائے دستوری بھی
تو اپنے لیے جگہ معین کر لے | دنیا میں غلامی بھی ہے مزدوری بھی

نجم نے سوشلسٹ مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا اور نہ صرف اس میں کوئی مغائرت پائی بلکہ ان اصولوں کا اقدار اسلامی سے گہرا ربط اور تعلق بھی پایا جس کو وہ جا بہ جا اپنے کلام میں نمایاں کرتے رہے۔

رباعی

دنیا ہمدرد آج مزدور کی ہے | حالت بھی چار سمت جمہور کی ہے
تیرہ سو برس سے کہتے آئے ہیں ہم | اب سمجھے ہو تم بات ذرا دور کی ہے

نجم اسلامی حکمراں کو ایک محنت کش مزدور سے متعارف کرتے ہیں:

رباعی

اسلام کا یہ نظام دستوری دیکھ | یہ عہد قدیم و طرز جمہوری دیکھ
ہے آج کی اشتراکیت پہ نازاں | سلماں کی گورنری و مزدوری دیکھ

یہ حقیقت ہے کہ آج کل تحریک آخری سانسیں لے رہی ہے۔ اتنی مضبوط اور اعلیٰ قدروں والی تحریک صرف چند دہائیوں میں اس لیے تمام ہو رہی ہے کہ اس نے عوام کے عقیدت کے رشتوں سے رشتہ کرنا کفر جانا، جب کہ ہر مذہب اور ہر اندیشۂ حیات میں رہ کر بھی ترقی کی

قدروں کو ترقی دی جاسکتی تھی۔ لیکن ترقی پسند ذہنوں نے اسے رجعت پسندی جان کر مراجعت نہ کی، ورنہ ترقی پسند تحریک ہر زندہ عقیدہ کی جان ہوتی۔ جب مزدوروں کے حامی حکمرانی کرنے لگے تو سلطانی فغفوری اور اقتدار کی کرسی کے نشہ میں مست ہوگئے اور مظلوم کے حامی خود ظالم بن گئے جن کو جبیر زمانہ برداشت نہ کرسکا۔ تجم نے فوراً اس طرف توجہ دلوائی:

رباعی

افلاس پہ مامور نظر آتا ہے مرکز سے بہت دور نظر آتا ہے
دستور بدل گیا حکومت بدلی مزدور بدستور نظر آتا ہے

رباعی

دل تیرا مساوات سے گھبرا ہی گیا غیروں کے اصول کا اثر چھا ہی گیا
اے کانگریس اے ہند کی منظور نظر تجھ کو بھی حکومت کا نشہ آ ہی گیا

رباعی

انسان کی جنس خام کہلاتے ہیں ناقابل احترام کہلاتے ہیں
سیدھے سچے جری جفاکش مزدور کیا ظلم ہے یہ عوام کہلاتے ہیں

تجم آفندی نے 1945ء میں بچوں کے لئے ایک بتیس (32) نظموں کا مجموعہ "ستارے" شائع کیا جس میں بچوں کی تفریح کے علاوہ معلوماتی نظموں کو شامل کیا۔ تجم جانتے تھے کہ انسانی عادتیں اور تہذیبی قدریں بچپن میں آسانی کے ساتھ پیدا کی جاسکتی ہیں۔ چناں چہ اس مجموعہ میں شامل نظم "مزدور کی آواز" کے اشعار پڑھ کر یہ سوچنا چاہیے کہ اگر یہ تحریکی آواز ہے تو پھر اس پر کان کیوں دھرے نہیں گئے۔ برصغیر کے استعماری نظام میں آنچل کو پرچم بنانے سے پہلے صنفِ نازک کی نرم کلائیوں کو سماجی ہتھکڑیوں سے رہا کرنے کی ضرورت تھی۔ مزدوروں کی چاک گریبانی اور کس مپرسی ان کی پیشانی کو محلوں کی دہلیز پر جبہ سائی میں بندہ پروری کا درس دے رہی تھی۔ اس پیشانی کو اٹھانا تھا، اس خم گردن کو علم کرنا تھا جس پر آنچل کا پھریرا لہرایا جاسکے۔ مجاز کی داستان مجازی رہ جاتی، اگر تجم کی طرح حقیقی لگن کے شعراء محروم افراد کی رگوں میں فولاد نہ بھرتے اور عزم وخودداری کا سبق نہ دیتے۔

مزدور کی آواز

مجھ سے نفرت کیوں ہے بیچ میں اگر مزدور ہوں — کیا تمھیں یہ وہم ہے انسانیت سے دور ہوں
ہے فقط سامانِ آسایش اگر انسانیت — میرے ہاتھوں سے بنی ہے بیشتر انسانیت
میرے ہی دم سے ہے جو کچھ ہے تمھارے آس پاس — یہ مکاں، یہ باغ، یہ بستر، یہ برتن، یہ لباس
میں نے لوہے کو گلایا میں نے توڑے ہیں پہاڑ — میں نے گلشن کر دیا، ورنہ یہ دنیا تھی اُجاڑ
علم سیکھا جن سے تم نے ان کتابوں کی قسم — میری ہمت نے بنایا ہے یہ کاغذ یہ قلم
ہے یہ بنیادِ ترقی میری ہی ڈالی ہوئی — ریل کی پٹری ہے میرے ہاتھ کی ڈھالی ہوئی
کوئی صنعت ہو مری محنت کا شامل ہے گداز — میری ہی طاقت نے پانی پر چلائے ہیں جہاز
میرا اک مل ہے جو بجلی سے بھرے تاروں میں ہے — سب یہ میرے بازوؤں کا زور طیاروں میں ہے
میں نے وہ ڈھانچہ بنایا جس میں یہ آواز ہے — ریڈیو نغمہ تمھارا ہے تو میرا ساز ہے
میری ہستی ہے تمھارے عیش و راحت کی مشین — سب مشینیں مجھ سے ہیں، میں ہوں وہ قدرت کی مشین

میرے جلوے سے ہیں روشن علم و حکمت کے چراغ
میری محنت گر نہ ہو بیکار ہیں سارے دماغ

نجم کے کلام میں آمد ہی آمد ہے۔ ایک معمولی سا مشاہدہ پوری نظم کا محور بن جاتا ہے۔ یہ مختصر سی نظم "ارے" دیکھئے اور اس نظم کا عنوان کیا اس سے اچھا ہو سکتا ہے اور کتنی سچی بات کا نقیب ہے۔

ارے.........

لگی جو راہ میں سرمایہ دار کو ٹھوکر — وسیع ہو گئی ہمدردیوں کی راہ گذر
کسی نے ہیٹ اٹھایا کسی نے پاکٹ بک — ہر ایک سمت سے جیسے اُبل پڑے نوکر
بہت خفیف سی چہرہ پہ آ گئی جو خراش — تو شاہراہ سے تا اسپتال تھا محشر
بندھا وہ بنگلہ پہ تانتا مزاج پرسی کا — کہ زندگی اُسے دو روز ہو گئی دوبھر
اسی سڑک پہ تھا اک دن رواں دواں مزدور — کچل گئی اسے سرمایہ دار کی موٹر

پولس نے لاش اٹھائی سڑک کو صاف کیا
خموش ہو گئی دنیا فقط "ارے" کہہ کر

ڈاکٹر ریاض فاطمہ تشیر نے اپنی کتاب علامہ تجم آفندی کی شخصیت اور فن میں بہت صحیح لکھا ہے۔ ''پھولوں کا ہار'' مجموعہ کلام 1917ء میں آگرہ سے شائع ہوا جس میں 16 رباعیاں، 22 نظمیں، 20 قصیدے اور ایک شخصی مرثیہ شامل ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں ایک نظم ''کسان'' کے عنوان سے ملتی ہے۔

یہ نظم اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ ''ترقی پسند تحریک'' سے بہت پہلے، بلکہ انقلاب روس سے بھی کچھ پہلے تجم نے اردو شاعری کو محنت کش طبقہ کی طرف متوجہ کیا اور وہ ''کسان'' اور ''مزدور'' جو بعد کے دور میں نعرہ بن گئے، تجم کے لیے بہت پہلے قابل توجہ تھے۔ ان کی شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے کسان کا پیکر نہیں تراشا بلکہ اس کی صفات پیش کی ہیں۔ اگرچہ اقبالؔ کے کلام میں دہقان کا تذکرہ ہے تو جوشؔ نے ''کسان'' میں محنت کش طبقہ کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ تاہم اولیت تجم آفندی کو حاصل ہے۔ جس نے سب سے پہلے کسان کو بحیثیت ''موضوع شعری'' روشناس کروایا، اسے تاریخ ادب نے یکسر فراموش کر دیا۔ اقبالؔ کی وہ نظمیں جو 1921ء کے بعد لکھی گئیں، ان میں لفظ دہقان استعمال کیا جب کہ جوشؔ نے 1928ء میں ''کسان'' پر مستقل نظم لکھی۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ تاجِ اولیت جو تجم کے سر پر ہونا چاہیے تھا دوسروں کے حصہ میں آیا:

کسان

ہے حیاتِ نوعِ انسانی تری ہستی کا راز
کچھ خبر بھی ہے تجھے او بھولے بھالے بے زباں
تجھ سے بہتر کس نے کیں خلقِ خدا کی خدمتیں
تجھ سے بڑھ کر سیر چشمی کی دکھائی کس نے شاں
ہے ترا مرہونِ منت بادشہ ہو یا گدا
ہے ترا ممنونِ احساں پیر ہو یا نوجواں
تجھ کو خالق نے دیا ہے رتبۂ ابرِ کرم
ہے ترے خوانِ کرم پر دوست دشمن میہماں
تو ہے با اخلاص خادم ایک ملک و قوم کا
بے ریا اک دوست ہے تو بے غرض اک مہرباں
تیرے نغمے ہیں فقط دلسوز تیرے کھیت پر
یہ بھلا دیتے ہیں سب دن بھر کی محنت کی تکاں
دل میں رکھ لیجے تری اُس وقت کی سچی خوشی
جب پلاتا ہے زمیں کو تیری پانی آسماں
قابلِ صد رشک ہے یہ سیدھی سچی زندگی
سادگی پر تیری صدقے شہریوں کی آن باں

تیرا طرزِ زندگانی ہے تصنع سے بری — تیری باتوں میں نہیں مطلق بناوٹ کا نشاں
دیکھنے والوں کی آنکھیں ہوں حقیقت میں اگر — ہیں کہیں محلوں سے بالاتر ترے کچے مکاں
تو نہیں واقف کہ کہتے ہیں کسے مکر و فریب — تجھ پہ ہوتا ہے مجھے اکثر فرشتے کا گماں
تجھ کو اُلفت ہے مویشی سے بھی بچوں کی طرح — دہر میں قائم ہے تیری ذات سے امن و اماں
قابلِ تقلید ہے یہ تیرا ایثار غریب — تو نے دنیا میں دیا ہے سب سے اچھا امتحاں
نجم کو اکثر کڑھاتی ہیں تیری جانکاہیاں — کون ہے ان تری اَن تھک کوششوں کا قدرداں

اپنی محنت کے ثمر وقفِ تمنائے جہاں
مرحبا اے مردِ میداں صاحبِ ہمت کساں

نجم آفندی نے اس نظم میں کسان کی اہمیت اور عظمت کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ شعرائے دربار بھی اس حق گوئی سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ چونکہ نظم خود اپنی بے زبانی میں شعلہ بیان ہے، ہم مزید اس پر روشنی ڈالے بغیر دوسری نظم جس میں "کسان کی فریاد" ہے، اس کے کچھ شعر یہاں پیش کرتے ہیں:

شہر کے رہنے سہنے والو — گاؤں کو جنگل کہنے والو
یہ ہے اک نرالی بستی — مایا مہنگی پتا سستی
بھید یہ کیا ہے صاف بتادوں — دنیا کا انصاف بتادوں
کھیتی کا ہے کام انوکھا — کام کا ہے انعام انوکھا
محنت کا یہ پھل ہے نیارا — بھوسہ میرا ناج تمھارا

دوسرا موضوع جس کو نجم آفندی نے اپنا سرنامۂ سخن کیا وہ واعظ، خطیب، مولوی اور مذہبی نما سرمایہ داروں کا ریاکارانہ رویہ تھا۔ جو تقریر میں غریبوں کی حمایت اور میدانِ عمل میں سرمایہ داروں کے دوست اور آلۂ کار تھے۔

قطعہ

جزوِ تن اچھی سے بھی اچھی غذا — زیبِ تن بہتر سے بھی بہتر لباس
ذکر لب پر فقر اہلِ بیت کا — مرحبا اے واعظِ معنی شناس

قطعہ

خدمت میں جو وارد ہو کوئی صاحبِ دولت — تعظیم کو بڑھتا ہے عمامہ بھی عبا بھی
تعظیم کا کیا ذکر ہے پہلو بھی نہ بدلیں — آجائے اگر صورتِ مفلس میں خدا بھی

رباعی

بھولے سے کبھی عقل کے ناخن لیتا — تاریخ نہ قصہ کی طرح سُن لیتا
دولت کی ہوا سے دور رہ کر اے کاش — سلمان کی طرح ٹوکری بُن لیتا

سرمایہ داروں اور دولت مندوں کے محل غریبوں کے ویرانوں پر بنائے جاتے ہیں اس لئے غریبوں کی آہوں سے بچنا ناممکن ہوتا ہے۔ نجم کہتے ہیں:

رباعی

اے دامنِ دولت و امارت کے پلے — زیبا ہے غریب سے اگر بچ کے چلے
مزدور کی منتشر ہیں آہیں جس میں — جب جائیں کہ اس فضا میں تو سانس نہ لے

رباعی

دولت کے نشہ میں یہ دریدہ دہنی — آساں ہے غریبوں کی تجھے دل شکنی
اے پیرو دینِ حق یہ مسلک تیرا — جیسے کہ بیگانۂ خلقِ حسنی

اس مضمون کے اختتام پر ہم نجم کی شاعری کا ہدف جو انسان دوستی اور انسانیت کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے، پیش کریں گے۔ نجم ادب برائے ادب اور ادب برائے ہدف دونوں کے قائل ہیں، جہاں وہ شعری استعاروں میں کسان اور مزدور کی عظمت کو ظاہر کرتے ہیں، وہ مزدوری کو ایک اعلیٰ قدر جانتے ہیں اور اُسے ان برگزیدہ شخصیتوں سے ربط دیتے ہیں جو پہلے سے انسانوں کے دلوں میں جگہ کئے ہوئے ہیں۔ خودداری، قناعت، توکل، صبر، حوصلہ اور شجاعت کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری اور ایمان داری کا خوب صورت امتزاج نجم کی شاعری میں ملتا ہے۔ نجم کا حوصلہ دیکھئے۔

رباعی

حق بات پہ اَڑ کے بیٹھ بوذر کی طرح — اٹھ شیر صفت مالکِ اشتر کی طرح
سرمایہ پرستوں کی خوشامد میں نہ رہ — دولت کو دعا نہ دے گداگر کی طرح

منتخب اشعار

شعر (45)

جو مدح کی ہو کبھی غیر کی زباں جل جائے　　خلوصِ فکر کے پھولوں کا ہار لایا ہوں
نہ آرزوے جناں ہے نہ حسرتِ کوثر　　عجب طبیعتِ مدحت شعار لایا ہوں
نمائشی ہیں عزا میں کمی خلوص کی ہے　　یہ درد درد کے پروردگار لایا ہوں

ہم چشم زمانہ میں کھٹکا کیے مدت تک　　ہم سے رہی برگشتہ دنیا کی نظر برسوں
اشعار نہ کہہ دینا ٹکڑے ہیں مرے دل کے　　بے درد تو جائے گا دل سے نہ اثر برسوں

کس لیے اغیار کو ہنسنے کا موقع دیجیے　　بات جب منہ سے نکالی ہے تو پوری کیجیے

خالی کبھی جانے کا نہیں تجم کا نالہ　　رکھتا ہے اثر صورِ قیامت کے برابر
دیکھے ہیں انھیں آنکھوں نے اَسرارِ فلک کے　　جاتا نہیں اب مرغِ نظر چھت کے برابر

دونوں دریا تیرے پہلو میں ہیں دو دریائے نور　　ہیں یہ دو معشوق الڑھ دو عیس ہیں پُرغرور
دو شرابی مست ہیں کھوئے ہوئے عقل و شعور　　سچ اگر پوچھو تو دو مصراع موزوں ہیں ضرور

جمالیاتی حسن نجم کے شعروں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ذیل کی نظم کا اختتام تاثرات کا ارمغان ہے۔ بے شک نجم سرمایہ داری کے مخالف ہیں بلکہ سرمایہ داروں کے ظلم کے خلاف اردو شعروادب کی پہلی احتجاجی آواز ہیں۔ ہم اس تحریر کو اس خوبصورت نظم پر تمام کرتے ہیں:

مزدوری

گرد کا ہے اور نہ بادل کا نشان — صاف ستھرا ہے عرب کا آسمان
دوپہر کا وقت گرمی کا شباب — ضو فشاں وسطِ سما میں آفتاب
دور سے ظاہر حجازی شان ہے — سامنے خرموں کا نخلستان ہے
تازگی ہے پتہ پتہ سے عیاں — آب پاشی کررہا ہے اک جواں
آستیں کہنی تک تانے ہوئے — دامنوں کو اپنے گردانے ہوئے
رنج غربت کی نہیں ہے چھاؤں تک — سر سے بہتا ہے پسینہ پاؤں تک
نام وہ جس کی دو عالم میں نمود — صورت ایسی بھیجئے جس پر درود
کوئی فکرِ تاج فغفوری میں ہے — اور یہ خوش اپنی مزدوری میں ہے
دل میں ہوگے تم یہی سمجھے ہوئے — ہے یہ محنت اپنے بچوں کے لیے
آرہا ہے دیکھ لو وہ حق شناس — کچھ فقیرانِ عرب ہیں آس پاس
ان کی خاطر تھی مشقت سر بسر — بانٹتا ہے اپنی محنت کے ثمر
تا درِ دولت یہ مجمع ساتھ تھا — گھر میں جب پہنچا تو خالی ہاتھ تھا

اب شریفوں کو ہے مزدوری سے عار
کیا علی سے بڑھ کے ہیں یہ ذی وقار

نہ پایا اہلِ عالم نے کسی قلبِ طپیدہ سے — دیا شبیرؑ نے پیغام جو حلقِ بریدہ سے
کوئی آسان ہے زنجیر چھونا بابِ مقصد کی — مسافر راستہ بھر موت سے زور آزماتا ہے
زمانہ ٹوکتا رہتا ہے بڑھ جاتے ہیں دل والے — صبا منہ زوریاں کرتی ہے غنچہ کھل کھلاتا ہے
ارادی قوتیں نقشہ بدل دیتی ہیں دنیا کا — ثباتِ عزم پر ایک ایک لمحہ سر جھکاتا ہے
سمجھتے ہیں مگر مردِ عمل یہ رازِ مستقبل — ہمارا ہر عمل ہر قول مستقبل بناتا ہے

کیا حقیقت مرے اشعار کی کیا مقام — عرشِ خالق سے جہاں آئے درود اور سلام

دردِ ملت بھی رہے شاملِ متاعِ ہوش میں — پرورش پا کر غمِ شبیرؑ کی آغوش میں

پست ہو دنیا میں ایسا اس کا آئینِ حیات — ہائے جس ملت کے سر میں ہو غرورِ کربلا
تیری ہی آواز ہوتی وسعتِ کونین میں — تو سمجھ لیتا جو منشائے ظہورِ کربلا
تیرا ذوقِ آگہی اب تک اسی منزل میں ہے — چار آنسو تک نہ رہ پائے شعورِ کربلا

ملت میں تفرقہ کا نہ سامان کیجئے — قرآن کے ورق نہ پریشان کیجئے
جاں دی تھی اتحاد کی خاطر حسینؑ نے — پورا شہیدِ ظلم کا ارمان کیجئے
کچھ درد سے حسینؑ کے لے کر گداز دل — للہ اپنے دل کو مسلمان کیجئے
سرکارِ دوجہاںؐ کی محبت کے نام پر — آپس کے اختلاف کو قربان کیجئے
مرکز بنا کے آج حسینی نشان کو — دنیا میں اتحاد کا اعلان کیجئے

تیسرا دریا نہیں یہ ہے اشارہ صاد کا　　تیرا سنگم ہے کہ مطلع ہے کسی استاد کا

دو نمازی منہمک ہیں سجدۂ معبود میں　　دو مسافر ہیں تلاشِ منزلِ مقصود میں

دیکھنے والوں کی آنکھیں ہوں حقیقت میں اگر　　ہیں کہیں محلوں سے بالا تر ترے کچے مکاں
تو نہیں واقف کہ کہتے ہیں کسے مکر و فریب　　تجھ پہ ہوتا ہے مجھے اکثر فرشتے کا گماں
تجھ کو الفت ہے مویشی سے بھی بچوں کی طرح　　دہر میں قائم ہے تیری ذات سے امن و اماں
اپنی محنت کے ثمر وقفِ تمنائے جہاں　　مرحبا اے مردِ میداں صاحبِ ہمت کساں

جوشِ وحشت میں نکل جاؤں کدھر　　تجھ کو گھیرے ہیں حصارِ صبح و شام

بھید یہ کیا ہے صاف بتادوں　　دنیا کا انصاف بتادوں

محنت کا یہ پھل ہے نیارا　　بھوسہ میرا ناج تمہارا

جس طرح چاہیں زمانہ کو بدل دیں اہلِ دل　　پست ہمت ہیں جنہیں اگلا زمانا چاہیے

کیوں آج شاد ہوں نہ عدوِ اہلِ بیت کے　　آپس میں لڑ رہے ہیں ثنا خوانِ اہلِ بیت
ایثار کی تپش میں گزاریں وہ زندگی　　جن کو ہے فکر سایۂ دامانِ اہلِ بیت

نہ پایا اہلِ عالم نے کسی قلبِ طپیدہ سے — دیا شبیرؑ نے پیغام جو حلقِ بریدہ سے
کوئی آسان ہے زنجیر چھونا بابِ مقصد کی — مسافر راستہ بھر موت سے زور آزماتا ہے
زمانہ ٹوکتا رہتا ہے بڑھ جاتے ہیں دل والے — صبا منہ زوریاں کرتی ہے غنچہ کھل کھلاتا ہے
ارادی قوتیں نقشہ بدل دیتی ہیں دنیا کا — ثباتِ عزم پر ایک ایک لمحہ سر جھکاتا ہے
سمجھتے ہیں مگر مردِ عمل یہ رازِ مستقبل — ہمارا ہر عمل ہر قول مستقبل بناتا ہے

کیا حقیقت مرے اشعار کی کیا مقام — عرشِ خالق سے جہاں آئے درود اور سلام

دردِ ملت بھی رہے شاملِ متاعِ ہوش میں — پرورش پا کر غمِ شبیرؑ کی آغوش میں

پست ہو دنیا میں ایسا اس کا آئینِ حیات — ہائے جس ملت کے سر میں ہو غرورِ کربلا
تیری ہی آواز ہوتی وسعتِ کونین میں — تو سمجھ لیتا جو منشائے ظہورِ کربلا
تیرا ذوقِ آگہی اب تک اسی منزل میں ہے — چار آنسو تک نہ رہ پائے شعورِ کربلا

ملت میں تفرقہ کا نہ سامان کیجئے — قرآن کے ورق نہ پریشان کیجئے
جاں دی تھی اتحاد کی خاطر حسینؑ نے — پورا شہیدِ ظلم کا ارمان کیجئے
کچھ درد سے حسینؑ کے لے کر گداز دل — للہ اپنے دل کو مسلمان کیجئے
سرکارِ دوجہاںؐ کی محبت کے نام پر — آپس کے اختلاف کو قربان کیجئے
مرکز بنا کے آج حسینی نشان کو — دنیا میں اتحاد کا اعلان کیجئے

اب شریفوں کو ہے مزدوری سے عار　　　کیا علی سے بڑھ کے ہیں یہ ذی وقار

نجم اسلام حقیقی کبھی مٹنے کا نہیں　　　حسن سبز قبا سے ہے نشانِ اسلام

اب اس فضا میں رہنے کو دل چاہتا نہیں　　　اب نجم ترک ہند کا سامان کیجئے

میں ہوں وہ نجم درخشاں سپہر مدحت کا　　　بغل میں خاک دلِ بے قرار لایا ہوں

جو نجم کو کہنا تھا لمحوں میں وہ کہہ گزرا　　　اب آگے مقدر ہے سمجھو نہ اگر برسوں

شافع مطلق ہے تو اور یہ دوائے دردِ دل　　　نجم جلد آنکھوں سے یارب شیعہ کالج دیکھ لے

یہ سکونِ دل کا عالم بے دلی سے کم نہیں　　　نجم بیٹھے کیا ہو کچھ طوفاں اٹھانا چاہیے

اس سے بہتر نجم دنیا میں کوئی تحفہ نہیں　　　دوست بھیجیں دوستوں کو ارمغانِ اتحاد

○

علامہ نجم آفندی
کی
نظموں کا مجموعہ

شمارہ	عنوان	مطلع	تعداد شعر	در حال	صفحہ
16	خلوصِ فکر	دیارِ ہند سے دل داغ دار لایا ہوں	(19)	اظہار	
17	دوسالی گورنمنٹ	فقیر خوار ہے اک جم کی حقیقت کیا	(11)	قومی درد	
18	دل کے ٹکڑے	ہم سا بھی نہ بد قسمت عالم میں ہوگا	(26)	قومی درد	
19	دردِ دل	کون سنتا ہے کسے کوئی سنائے دردِ دل	(18)	شیعہ کالج	
20	درِّ یتیم	مائل حسرت بیانی ہے دلِ حسرت نواز	(75)	یتیم خانہ	
21	نقدِ دل	اے چمن زارِ جہاں اے لکھنؤ کی سرزمیں	(60)	شیعہ کالج	
22	ہماری عید	عید کو کیا کہیے ہر جائی ہے عید	(21)	عید	
23	ترانۂ عید	جن و بشر ہیں شادماں کون و مکاں میں عید ہے	(8)	عید	
24	تمنا	قضا کا کیا ٹھکانہ زندگی کا کیا بھروسہ ہے	(17)	شیعہ کالج	
25	ارمغانِ اتحاد	کیوں نہ دل میں گھر کرے لطفِ بیانِ اتحاد	(9)	اتحاد	
26	ترانۂ اتحاد	دلِ عالم تو تھا ہی معترف حُسنِ معانی کا	(17)	شیعہ کالج	
27	تمہید ستانِ قسمت	نہ بڑھ حد سے زیادہ گرمیٔ جوشِ وفا دم لے	(9)	تاریخ اسلام	
28	ترقی کا راز	ایسے نازک وقت میں اللہ یہ کس کی ہے بزم	(9)	اتفاق آرا	
29	گھبرائیں کیا	ایک دن ایک دوست سے میں نے کہا	(11)	مشیتِ الٰہی	
30	اسلامی فرقے	ہرج ہے کچھ جو رکھیں دل کے عقائد دل میں	(5)	رواداری	
31	نالۂ عجم	ہم بھی تھے کبھی قابلِ تعظیم جہاں میں	(43)	تاریخ اسلاف	
32	میرزا تو مہمان	عبدالغنی بیچ بتا وہ بھی زمانہ یاد ہے	(14)	رفتگان	
33	پریاگ راگ	یاد ہے مجھ کو الٰہ آباد وہ مطلعِ چمن	(27)	گنگا جمنا	

(1)

مناجات

اے دل میں دردِ دل کی دنیا بسانے والے
تطہیرِ غم سے غم کو نعمت بنانے والے

تخئیل کا مصفّٰی دریا بہانے والے
جذبات کا مسلسل طوفاں اٹھانے والے

اے بات کرنے والے فطرت کی خامشی میں
شاعر کے آنسوؤں میں اے مسکرانے والے

اے سوزِ دل کے خواہاں دو دو جگر کے گاہک
آنکھوں میں بیکسوں کی دُھونی رمانے والے

اے طور کے اُجالے بگڑی مری بنا دے
ایمن کی وادیوں میں باتیں بنانے والے

پندارِ عاشقی کو دے اذنِ باریابی
خاکستر زمیں پر سجدے کرانے والے

میں جی رہا ہوں میری ہمت پہ بھی نظر کر
بسمل سے زیرِ خنجر آنکھیں لڑانے والے

توفیقِ اشکِ غم سے دامن کو گلکدہ کر
دامانِ یوسفی کی کلیاں کھلانے والے

ہر موجِ حسن کا رُخ اس دل کی سمت کر دے
کلیوں میں نکہتوں کے دریا بہانے والے

تکلیف کرنے والے آغازِ عاشقی میں
تکمیلِ بیخودی میں تشریف لانے والے

آ دل کی سادگی میں کچھ اور کر اضافہ
اے عشق کو وفا کی پٹی پڑھانے والے

موجیں مجھے چھپالیں خونابۂ جگر کی
اے بادلوں کی تہہ میں بجلی چھپانے والے

کونین طے کرادے ہلکا سا پینگ دیکر
امید کی فضا میں جھولا جھلانے والے

آ خاکِ آرزو کے ذرّوں میں مسکرا دے
آغازِ آرزو میں اے مسکرانے والے

اس در کی رہبری کریں جس کے خادموں میں
جبرئیل سے فرشتے پیغام لانے والے

(2)

دردِ دل

کجا شعر و سخن جینا بھی ہے مشکل ضعیفی میں
کہاں تک ساتھ دیں گے یہ دماغ و دل ضعیفی میں

تقاضا وقت کا تھا اب نہ طولِ داستاں کرتے
زمانہ ہو گیا قومی اداروں میں فغاں کرتے

بہت چاہا ملیں دنیا سے گردِ کارواں ہو کر
ٹھہرنا ہی پڑا کچھ دن یتیموں کی زباں ہو کر

ضرورت ہے کہ ملت ان کو دادِ بے زبانی دے
ذرا سا اپنے حصے کا سرورِ زندگانی دے

اٹھو راحت پسندو ختم دورِ بیخودی کر دو
کبھی تو اپنے سامانِ تعیش میں کمی کر دو

بھٹک سکتے نہیں منزل سے آیاتِ جلی والے
یتیموں سے بہت کچھ ربط رکھتے ہیں علی والے

پیمبرؐ کی روش عترت کا اندازِ کرم سمجھو
شریعت چاہتی ہے ان کے غم کو اپنا غم سمجھو

صلوٰۃ و صوم بھی برحق ہیں ان حق کا اگر جانا
کہیں زعمِ عبادت میں نہ بے پروا گزر جانا

ہر اک اہلِ عزا جب ان کے غم کا چارہ گر ہوگا
غمِ شبیرؑ میں رونا جبھی کچھ بارور ہوگا

کبھی تقلید اہلِ بیتؑ کو بھی دل مچلتا ہے
کہیں صلوات کے نعروں سے خالی کام چلتا ہے

جنہیں دولت خدا نے دی ہے اس میں ان کی شرکت ہے
غلط مصرف خداوندی امانت میں خیانت ہے

ہم اہلِ بیتؑ کے پیرو ہیں یہ دنیا کو دکھلاؤ
معیشت کی فضا میں ان کو اپنی سطح پر لاؤ

ہماری قوم کا ہر فرد کہلاتا ہے دل والا
یتیموں کو یتیموں کی طرح پالا تو کیا پالا

خبر کیا ہے کسی کو ہے اہم کتنا سوال ان کا
امامِ عصرؑ کے پیش نظر رہتا ہے حال ان کا

(5)

حسینؑی پیغام

بہت کچھ فطرتِ ماسور نے کی عالم آرائی
یہ اعجازِ کلیمی اور یہ اعجازِ مسیحائی

سیاست نے بہت دنیا پہ شمشیرِ جفا تولی
ہزاروں دلنشین لہجوں میں حکمت نے زبان کھولی

تمدن نے سنائے زندگی کے بارہا نغمے
بہت گونجے فضا میں بانسری کے دلربا نغمے

بجاتے اپنا ڈنکا فلسفہ کے مسئلے آئے
کتابِ عقل و دانش لیے لاکھوں منچلے آئے

نہ پایا اہلِ عالم نے کسی قلبِ طپیدہ سے
دیا شبیرؑ نے پیغام جو حلقِ بریدہ سے

(6)

مستقبل

زمانہ فتنہ پرور دور سے آنکھیں دکھاتا ہے
دلِ ہمت نشین دیکھتا ہے مسکراتا ہے

نظر آتے ہیں خوں آشام جب آثارِ منزل کے
جری انگڑائیاں لیتا ہے بزدل تھرتھراتا ہے

کوئی آسان ہے زنجیر چھونا بابِ مقصد کی
مسافر راستہ بھر موت سے زور آزماتا ہے

زمانہ ٹوکتا رہتا ہے بڑھ جاتے ہیں دل والے
صبا منہ زوریاں کرتی ہے غنچہ گل کھلاتا ہے

سمجھتا ہے اُسے اپنا مقدر صاحبِ ہمت
جبینِ آسماں پہ جو ستارہ جگمگاتا ہے

ارادی قوتیں نقشہ بدل دیتی ہیں دنیا کا
ثباتِ عزم پہ ایک ایک لمحہ سر جھکاتا ہے

(3)

مودّت

غرور اگرچہ کسی بات پر نہیں جائز
مگر میں ان کی محبت پہ ہوں ذرا مغرور
وہ خستہ حالِ محبت نہیں میں اے واعظ
کہ جیسے بوجھ اٹھائے ہوئے کوئی مزدور
بہشت بھی نہیں درکار غیر کے ہاتھوں
خوشی ہو ان کی تو دوزخ بھی ہے مجھے منظور
قصوروار ہوں در سے نہ جاؤں گا لیکن
کروں گا مدح سرائی بہ اعترافِ قصور
خدا نصیب کرے میرے ہمصفیروں کو
یہ افتخارِ محبت یہ امتیازِ غرور
میں خوش ہوں دار پہ بھی کھینچ دے اگر کوئی
مثالِ میثمِ تمار و صورتِ منصور

(4)

عصرِ حاضر

تاریخ ہے گواہ کہ ہر ایک دور میں
کیا متحد رہے ہیں غلامانِ اہلِ بیت
کیوں آج شاد ہوں نہ عدو اہلِ بیت کے
آپس میں لڑ رہے ہیں ثنا خوانِ اہلِ بیت
قربان کر رہے ہیں وہ اغراض پر اصول
کل تک تھے جان و دل سے جو قربانِ اہلِ بیت
ان کا اگر یہ طرزِ عمل ہو تو ہے بجا
حاصل نہیں ہوا جنہیں عرفانِ اہلِ بیت
غیرت نہ آئے گی جو کسی نے کیا سوال
ہوتے ہیں ایسے تابعِ فرمانِ اہلِ بیت
دربارِ اہلِ بیت میں جاتا ہوا اگر
کس منہ سے ہو سکیں گے یہ مہمانِ اہلِ بیت
خدمت ہو پُرخلوص محبت ہو پُر خلوص
وہ نذر چاہیے جو ہو شایانِ اہلِ بیت
ایثار کی تپش میں گزاریں وہ زندگی
جن کو ہے فکر سایۂ دامانِ اہلِ بیت

لرز جاتی ہے دورِ جبر و استبداد کی قوت / حقارت کے تبسم کی جہاں بجلی گراتا ہے
نکل جاتے ہیں خود راہِ طلب کے پیچ و خم یکسر / وہ سیدھی راہ کہلاتی ہے جس رستہ سے جاتا ہے
گزر جاتے ہیں کتنے راہزن طوفان کترا کر / تلاطم دم بخود رہتا ہے فتنہ جی چراتا ہے
فلک قدموں پہ گر جاتا ہے جب تیور بدلتے ہیں / زمیں دولت اگل دیتی ہے جب ٹھوکر لگاتا ہے
سیاہی خود الٹتا ہے ورق تاریخِ عالم کا / لگا کر مہر اپنے خون کی خود مسکراتا ہے
حسابِ وقت کیسا انتظارِ وقت کیا معنی / خود اپنا دستِ قدرت وقت کا پردہ اٹھاتا ہے

سمجھتے ہیں مگر مردِ عمل یہ رازِ مستقبل
ہمارا ہر عمل ہر قول مستقبل بناتا ہے

(7)

سن اکسٹھ

سن اکسٹھ ہو کہ باسٹھ ہو ہمیں تو دیکھنا یہ ہے / کہاں تک ہے طبیعت میں حقیقت کی پذیرائی
اثر کتنا لیا کتنی بنائی زندگی اپنی / بہت تقریر کی اب تک بہت تحریر چھپوائی
بہت آہیں بھریں سن کر وفا عباسؑ غازی کی / بہت روئے تڑپ کر زیرِ منبر سب تولائی
کہا ایک ایک نے مڑ مڑ کے اپنے ہم نشینوں سے / ہمیں واللہ مولانا نے کیا تقریر سنوائی
گرے دو چار آنسو ہو گئی کچھ معرفت حاصل / خدا شاہد ہے یہ مجلس ہمیں بے حد پسند آئی
مقرر کی طرف گھبرا کے آنسو پونچھتے پہنچے / لپک کر دست بوسی کی زراہِ قدر افزائی

چلے جب اٹھ کے مجلس سے تو دل میں یہ تصور تھا
کہ زک اس مسئلے میں کس طرح بھائی کو دے بھائی

(8)

پیام

مزاجِ شعلہ سے پیدا ہو برگ و یاسمن اب بھی
جوانوں کی ادا میں ہے وہ اعجازِ چمن اب بھی

مٹا دے جو غرورِ خسروی کو اے خدا والے
ترے بازو میں ہے وہ قوتِ خیبر شکن اب بھی

زمینِ کربلا میں جس خدا والے کا گھر لوٹا
اسی سے رزم آرا ہیں خدایانِ وطن اب بھی

شہیدانِ وفا نے خوں بہایا اس طرح حق پر
کہ سر سبز و نشاط انگیز ہے دیں کا چمن اب بھی

اٹھ اور اٹھ کر جہادِ حیدری کی یاد تازہ کر
کہ تیری راہ میں ہیں سومناتانِ وطن اب بھی

مزاجِ کبر و نخوت کے پرستارو خبر بھی ہے
جوانوں کے دلوں میں بجلیاں ہیں موجزن اب بھی

یہ کس مردِ خدا نے طاقتِ طاغوت کو توڑا
ہے مرعوبِ وقارِ نوعِ انساں اہرمن اب بھی

خلوص و عزم و استقلال سے چلنا اگر سیکھیں
جواں مردوں کے ہاتھوں میں ہے تقدیرِ زمن اب بھی

جہاں شبیرؑ نے کمیاوی طاقت کو توڑا تھا
پیامِ امن دیتا ہے زمانے کو وہ بن اب بھی

(9)

نشانِ اسلام

حسنِ صورت ہی سے اسلام کا ملتا ہے پیام
اس کے دل اس کی زباں اس کی نظر سے اسلام

کوئی آگاہ نہیں علمِ الٰہی کے سوا
کس کی ہمت ہے معیّن جو کرے اس کا مقام

کیا حقیقت مرے اشعار کی کیا میرا مقام
عرشِ خالق سے جہاں آئے درود اور سلام

حسنِ سبز قبا نازشِ دینِ اسلام
دینِ اسلام ترے صبر و تحمل کا ہے نام

کام بھی فطرتِ انساں میں ہے آرام بھی ہے
تیرے صدقے میں سحر ترے تصدق میں ہے شام

آج دنیا میں بہت شور مساوات کا ہے
یہ مساوات ہے تیرے ہی عمل کا پیغام

کیا دلِ بانیِ اسلام کا عالم ہوگا
کب سے جھگڑوں میں ہے آپس کے یہ مذہب بدنام

سب کو منظور ہیں صدیوں سے جو ہیں رسم و رواج
کیوں نیا فتنہ اٹھائے کوئی شہرت کا غلام

متحد ہیں تو فقط ایک ہی خوش فہمی ہے
اپنی دانست میں ہر فرقہ ہے فردوس مقام

ذکر اوروں کا ہے کیا تفرقے اپنوں میں بھی ہیں
لغزشِ فکر سے افراد ہیں کتنے تہہ دام

اپنے حلقہ سے ہے باہر جو ادیب و شاعر
فرد کامل ہے مگر اس کے سخن میں ہے کلام

علما میں بھی ہیں کچھ طالب شہرت ایسے
قوم کے نفع سے مطلب نہ ہے نقصان سے کام

کیا اسی دن کے لیے تھا یہ خدائی پیغام
ایک اسلام کے ہو جائیں بہتر اسلام

اختلافات یقینی ہیں یہ صورت ہو جہاں
پھر تعصب کے بخارات کا بھی ہے سرسام

دل میں کیوں آتا ہے آخر یہ عقیدہ کا سوال
یعنی دنیا کے مسائل میں ہے کیا اس کا مقام

ٹوٹتی جاتی ہے قوت یہ خبر ہے لیکن
سب گوارا ہے نکلتا ہو جو اپنا کوئی کام

کچھ حکومت میں ہو اعزاز کی امید کہیں
ذبح کر دیں گے اگر بیچ میں آئے اسلام

اس سے بڑھ کر جو دل آویز ہو صورت کوئی
تو نمازوں کے فریضہ کو بھی بندہ کا سلام

حاشیہ جو بھی بنا دے انہیں خوش ہیں ایسے
ان خطابوں کو سمجھتے ہیں خدا کا پیغام

اہل ہیں جو کسی منصب کے انہیں فکر نہیں
وہ خطابوں سے گراں بار بناتے نہیں نام

اللہ اللہ حق آلِ پیمبرؐ کے لیے
جزو ایماں ہو جہاں مجلس و ماتم کا قیام

اپنے مطلب میں نہ رکھیں حق و باطل کا خیال
دوسروں کے لیے ہے صرف یہ مہلک الزام

مسئلہ ہی نہیں کوئی حق و ناحق کے سوا
اسی بنیاد پہ ہے مذہب حقہ کا نظام

قوم مٹ جائے گی آپس ہی میں لڑتے مرتے
ہے مگر آلِ محمدؐ کی حکومت کو دوام

نجم . اسلام حقیقی کبھی مٹنے کا نہیں
حسنِ سبز قبا سے ہے نشانِ اسلام

(10)

ارے............

لگی جو راہ میں سرمایہ دار کو ٹھوکر
وسیع ہو گئی ہمدردیوں کی راہ گذر

کسی نے ہیٹ اٹھایا کسی نے پاکٹ بک
ہر ایک سمت سے جیسے اُبل پڑے نوکر

بہت خفیف سی چہرہ پہ آ گئی جو خراش
تو شاہراہ سے تا اسپتال تھا محشر

بندھا وہ بنگلہ پہ تانتا مزاج پرسی کا
کہ زندگی اُسے دو روز ہو گئی دوبھر

اُسی سڑک پہ تھا اک دن رواں دواں مزدور
کچل گئی اسے سرمایہ دار کی موٹر

پولس نے لاش اٹھائی سڑک کو صاف کیا
خموش ہو گئی دنیا فقط "ارے" کہہ کر

(11)

بانیِ مجلس

بانیِ مجلس خدا تجھ کو جزائے خیر دے
ہو ترا ذوقِ عمل تقلیدِ انصارِ حسینؑ
نبض کی رفتار میں حُر کے ارادہ کی روش
اُسوۂ شبیرؑ کے سایہ میں دم لینا نصیب
پھول سے ہلکا رہے رختِ گرانبارِ حیات
مسلمِ ابنِ عوسجہ کا حوصلہ ہو راہبر
دردِ ملت بھی رہے شاملِ متاعِ ہوش میں

خیر کی توفیق بے حد یہ بنائے خیر دے
دل قوی جذبہ سلامت اے عزادارِ حسینؑ
خون میں عزمِ حبیب ابنِ مظاہر کی روش
دوش پر ملت کی عظمت کا علم لینا نصیب
کھول دے رازِ شہادت تجھ پہ اسرارِ حیات
باندھ لے شالِ عزا سے اپنی ہمت کی کمر
پرورش پا کر غمِ شبیرؑ کی آغوش میں

(12)

آہ تسنیم

وہ دن بھی عجب دن تھے جب گھر میں یہ دولت تھی
کیا اس کو خبر کتنی بابا کو محبت تھی
کس دل سے غریبوں پہ یہ ظلم کیا تو نے
ماں باپ تصور میں بے جان سے بیٹھے ہیں
اس غم کو وہ سمجھیں گے جو درد کے مارے ہیں
یوں رنجِ لحد اُس کو آغوش میں جا دینا
ننھا سا مسافر ہے آرام ذرا دینا
میں تجھ پہ تصدق اے تسنیم کے گہوارے

تسنیم مری بچی سرمایۂ راحت تھی
وہ سب سے تھی بے پروا وہ اک گلِ جنت تھی
کس پھول کو توڑا ہے اے دستِ قضا تو نے
باتوں کے کلیجہ میں نشتر ہیں کہ چبھتے ہیں
بستر ہے کہیں رکھا کپڑے ہیں کہیں رکھے ہیں
آغوش کا مادر کی انداز دکھا دینا
سونے سے اگر چونکے بہلا کے سلا دینا
سب دور ہیں کون اس پہ اب جان و جگر وارے

نوٹ: یہ نظم نجم آفندی نے اپنی بیٹی کے انتقال پر کہی تھی۔

(13)

غرورِ کربلا

کچھ خبر ہے تجھ کو اے پروانۂ بے بال و پر　　روشنی دیتی ہے کب سے شمعِ طورِ کربلا

ذہنیت میں آج تک باقی ہے کیوں یہ تیرگی　　جلوہ گر ہے جب دماغ و دل میں نورِ کربلا

ہوگیا بیدار دس دن کو اگر جذبہ تو کیا　　طے نہ ہوگی اس طرح سے راہِ دورِ کربلا

بر بنائے ہوش ہوگا کب ترا جوشِ عمل　　کربلا پھر چاہتا ہے کیا حضورِ کربلا

تیری ہی آواز ہوتی وسعتِ کونین میں　　تو سمجھ لیتا جو منشائے ظہورِ کربلا

تیرا ذوقِ آگہی اب تک اسی منزل میں ہے　　چار آنسو تک نہ رہ پائے شعورِ کربلا

پست ہو دنیا میں ایسا اس کا آئینِ حیات
ہائے جس ملت کے سر میں ہو غرورِ کربلا

(14)

اعلانِ اتحاد

ملّت میں تفرقہ کا نہ سامان کیجئے
قرآن کے ورق نہ پریشان کیجئے

جان دی تھی اتحاد کی خاطر حسینؑ نے
پورا شہیدِ ظلم کا ارمان کیجئے

یوں محنتیں کسی کی ملاتے ہیں خاک میں
اس طرح اُس کے غم کو نہ مہمان کیجئے

حل کی ہیں جس غریب نے سر دے کے مشکلیں
مشکل اب اُس پہ آئی ہے آسان کیجئے

سُنیے صدائے خونِ شہیدانِ کربلا
آراستہ نہ جنگ کا میدان کیجئے

لُوٹے ہوئے ریاضِ پیمبرؐ کا واسطہ
اسلام کے چمن کو نہ ویران کیجئے

ظلم اُس پہ دشمنوں کے کوئی کم نہیں ہوئے
پیدا نہ آپ ظلم کا عنوان کیجئے

اصغرؑ کے سِن کو دیکھیے اور اُس کی موت کو
اِک بے زباں کی رُوح پہ احسان کیجئے

کچھ درد سے حسینؑ کے لے کر گدازِ دل
للہ اپنے دل کو مسلمان کیجئے

سرکارِ دو جہاں کی محبت کے نام پر
آپس کے اختلاف کو قربان کیجئے

دشمن بہت ہیں ملّتِ بیضا کے دہر میں
مٹنے کا آپ اپنے نہ سامان کیجئے

مرکز بنا کے آج حسینی نشان کو
دنیا میں اتحاد کا اعلان کیجئے

اب اس فضا میں رہنے کو دل چاہتا نہیں
اب نجمؔ ترکِ ہند کا سامان کیجئے

(15)

مزدوری اور اس کا مصرف

گرد کا ہے اور نہ بادل کا نشان
صاف ستھرا ہے عرب کا آسمان

دوپہر کا وقت گرمی کا شباب
ضو فشاں وسطِ سما میں آفتاب

دور سے ظاہر حجازی شان ہے
سامنے خرموں کا نخلستان ہے

تازگی ہے پتے پتے سے عیاں
آب پاشی کررہا ہے اک جواں

آستیں، کہنی تلک تانے ہوئے
دامنوں کو اپنے گردانے ہوئے

رنج غربت کی نہیں ہے چھاؤں تک
سر سے بہتا ہے پسینہ پاؤں تک

نام وہ جس کی دو عالم میں نمود
صورت ایسی بھیجئے جس پر درود

کوئی فکرِ تاج فغفوری میں ہے
اور یہ خوش اپنی مزدوری میں ہے

دل میں ہوگے تم یہی سمجھے ہوئے
ہے یہ محنت اپنے بچوں کے لیے

آرہا ہے دیکھ لو وہ حق شناس
کچھ فقیرانِ عرب ہیں آس پاس

ان کی خاطر تھی مشقت سر بسر
بانٹتا ہے اپنی محنت کے ثمر

تا درِ دولت یہ مجمع ساتھ تھا
گھر میں جب پہنچا تو خالی ہاتھ تھا

اب شریفوں کو ہے مزدوری سے عار
کیا علی سے بڑھ کے ہیں یہ ذی وقار

(16)

خلوصِ فکر

دیارِ ہند سے دل داغدار لایا ہوں — امیدِ یک نگہہ شہریار لایا ہوں
تمام نکہت و نزہت تمام غنچہ و گل — میں اپنے باغِ سخن کی بہار لایا ہوں
سبھی ہیں آپ کے شاعر فصیح تا بہ سہیلؔ — ثنا کا سلسلۂ اُستوار لایا ہوں
بھرا کے رُوئے تمنا زر و جواہر سے — ہر ایک شعر جواہر نثار لایا ہوں
جو مدح کی ہو بھی غیر کی زباں جل جائے — خلوصِ فکر کے پھولوں کا ہار لایا ہوں
کسی سے ربط نہیں رشتۂ عقیدت کو — میں اپنا دامنِ دل تار تار لایا ہوں
نہ آرزوئے جناں ہے نہ حسرتِ کوثر — عجب طبیعتِ مدحت شعار لایا ہوں
خدا کا گھر ہے مگر نام آپ کا لے کر — فرازِ عرش سے تارے اُتارے لایا ہوں
بڑی جسارت بیجا ہے حاضری میری — کہ اپنے سر پہ گناہوں کا بار لایا ہوں
سزا قبول مجھے جرأتِ حضوری کی — میں اپنے دل پہ بہت اختیار لایا ہوں
مجالِ سجدہ نہیں اضطرارِ سجدہ ہے — یہ ایک جذبۂ دیوانہ وار لایا ہوں
حضورِ داد طلب صبر و ضبطِ ملت ہے — کہ خنجر کا غمِ انتظار لایا ہوں
علم بدوش بہت خانماں بدوش ہیں اب — عجب حکایتِ ناخوشگوار لایا ہوں
تمام قوم ہے احساسِ کمتری کی اسیر — شکایتِ ستمِ انکسار لایا ہوں
کسی میں اسوۂ انصار کی جھلک نہ ملی — متاعِ گریۂ لیل و نہار لایا ہوں
نمائشیں ہیں عزا میں کمی خلوص کی ہے — یہ درد درد کے پروردگار لایا ہوں
غرورِ اہلِ دول افتراقِ علم و عمل — تمام رازِ نہاں آشکارا لایا ہوں
رئیسِ علم بھی ہیں صیدِ اقتدار بہت — غریب ہوں گلۂ اقتدار لایا ہوں
میں ہوں وہ نجمِ درخشاں سپہرِ مدحت کا — بغل میں خاکِ دلِ بیقرار لایا ہوں

(17)

روحانی گورنمنٹ سے اپیل

فقیر خوار ہے اک تجم کی حقیقت کیا
کہ دم بخود ترے آگے ہیں خلقِ سبحانی

خطا معاف مگر اب نہیں ہے ضبط کی تاب
کہ اپنی حد سے بھی کچھ بڑھ گئی پریشانی

ضدیں اُٹھاتا ہے تو آپ اپنے بندوں کی
پھر اس پہ ناز کریں، کیوں نہ انسی و جانی

تجھے خبر ہے گزرتی ہے جو غریبوں پر
چھپا ہوا نہیں کچھ تجھ سے دردِ پنہانی

نہ اب ہیں قحط کے لائق نہ جنگ کے قابل
بہت ہوئی ترے بندوں کی خانہ ویرانی

اُٹھا ان آنکھوں سے طوفان اشکِ حسرت کا
نہ آئی کیوں ترے بحرِ کرم میں طغیانی

جسے بھی دیکھئے رنج و الم کی ہے تصویر
ہوئے ہیں دہر سے معدوم خندہ پیشانی

مصیبتیں جو ہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے
بنے ہیں بندۂ آزاد شکلِ زندانی

اُٹھے ہوئے ہیں دعاؤں کو سوکھے سوکھے ہاتھ
دکھا دے قحط میں لطف و کرم کی ارزانی

زیادہ حدِ ادب رُک گئے زبان و قلم
مخاطب اپنا نہیں کوئی گوشِ انسانی

چہ حاجت است بہ پیشِ تو حالِ دل گفتن
کہ حالِ خستہ دلاں را تو خوب می دانی

(18)

دل کے ٹکڑے

ہم سا بھی نہ بدقسمت عالم میں کوئی ہوگا
فریاد رہی اپنی محتاج اثر برسوں

ہو داد طلب کس سے حسرت زدگی دل کی
ترسا کیا درماں کو کیا دردِ جگر برسوں

ہم چشمِ زمانہ میں کھٹکا کئے مدت تک
ہم سے رہی برگشتہ دنیا کی نظر برسوں

ہم ہیں کہ زمانے کی مشقِ ستم ہم پر
ہم ہیں جو رہے وقفِ شمشیر و تبر برسوں

بربادی نے مدت تک کی اپنی ہوا خواہی
آباد کیا ہم نے ویرانی کا گھر برسوں

گیتی کی بلائیں تھیں گردوں کی جفائیں تھیں
دونوں نے کیا مل کر کیا زیر و زبر برسوں

دیواروں میں چنوایا زندہ کبھی جلوایا
بیداد رہی ہم پہ یہ آٹھ پہر برسوں

زندانِ بلا اپنے منت کشِ ہستی ہیں
خالی نہ رہے ہم سے اک دن بھی یہ گھر برسوں

ہم دفترِ ہستی میں اوراقِ پریشاں تھے
ملتی تھی نہ بھائی کو بھائی کو خبر برسوں

آرام سے کب گزری آرام سے کب بیٹھے
پھرتے رہے دنیا میں ہم خاک بسر برسوں

مشہور ہے عالم میں بے بال و پری اپنی
آزادی پہ ڈالی ہے حسرت سے نظر برسوں

اب اپنے ہی ہاتھوں سے ہوتا ہے ستم ہم پر
ممنون رہے پہلے غیروں کے اگر برسوں

اس عہد میں بیٹھے تھے دو چار ذرا مل کر
مانگی تھی دعا دل سے جب شام و سحر برسوں

اللہ کی قدرت سے دیکھا تھا یہ دن ہم نے
جس کا نہ گماں بھی تھا یاں پیشِ نظر برسوں

ہے قہر کہ ان میں بھی یوں تفرقہ پڑ جائے
مل بیٹھنے کو ترسیں جو آٹھ پہر برسوں

کچھ دن کی ریاضت تھی جس پر کہ ستم ٹوٹا
یہ داغ نہ جائے گا سینہ سے مگر برسوں

یہ صدر کا جھگڑا کیا سب صدر ہی ہیں ہم میں
ایسے جو اُٹھے فتنے کم ہوگا نہ شر برسوں

کچھ جرم بھی کہتا ہے کچھ جرم کی بھی سن لو
تازہ ہے ابھی قصہ چھیڑو گے سر برسوں

تم خونِ جگر سے بھی سینچو گے اگر اس کو
یہ نخل نہ لائے گا اس طرح ثمر برسوں

کرنا ہے جو کچھ تم کو مل جاؤ پھر آپس میں　　بس آج کہ کل پرسوں گزریں نہ مگر برسوں
خود مطلبیاں چھوڑو خود غرضی سے منہ موڑو　　حالت نہیں ہوتے کی پھر تو یہ دگر برسوں
مل جل کے زمانے میں جو چاہو گے کر لوگے　　یوں کچھ بھی نہیں ہوگا چاہا کرو کر برسوں
برٹش کی حکومت میں پائی ہے یہ آزادی　　واجب ہے کریں اس کا ہم شکر اگر برسوں
اشعار نہ کہہ دینا ٹکڑے ہیں مرے دل کے　　ہے درد تو جائے گا دل سے نہ اثر برسوں
جو تجھ کو کہنا تھا لمحوں میں وہ کہہ گزرا　　اب آگے مقدر ہے سمجھو نہ اگر برسوں

ہے کانفرنس اپنی امیدوں کا سرچشمہ
اللہ رکھے قائم اس کو باثر برسوں

(19)

دردِ دل

کون سنتا ہے کسے کوئی سنائے دردِ دل　　ہے عجب پُر درد قصہ ماجرائے دردِ دل
بھا گئی ہے اس قدر دل کو ادائے دردِ دل　　مدتوں سے دل اٹھاتا ہے جفائے دردِ دل
خونِ دل برسوں سے ہے ہمدم غذائے دردِ دل

ایسی شدت تھی نہ پہلے اس بلا کا درد تھا　　کرب تھا اتنا نہ بیچینی نہ ایسا درد تھا
ہوک سی اٹھتی تھی کچھ کچھ تھوڑا تھوڑا درد تھا　　ہلکی ہلکی سی چبک تھی میٹھا میٹھا درد تھا
یاد ہے مجھ کو جو کچھ تھی ابتدائے دردِ دل

تیز ناخن بن گئی اب مجھ کو ہستی درد کی　　چین ہی لینے نہیں دیتی ہے شوخی درد کی
اک زمانہ سے کبھی میں نے کہانی درد کی　　میں نے کس کس کو دکھائی سینہ کاوی درد کی
میں نے کس کس کو سنایا ماجرائے دردِ دل

درد کی شدت ہو جب ہمدرد ملتا ہے کہاں　　آہ و نالہ نے دکھائیں کیسی کیسی گرمیاں

تھک گیا اپنا اثر دکھلا کے جب سوزِ نہاں　　لے ہی آیا واہ واہ اے قاصد اشکِ رواں
ڈھونڈھ کر پنجاب سے اک آشنائے دردِ دل

مٹ گئی باتوں پہ دنیا اس بلا کا سحر تھا　　کچھ حسینوں کی نظر سے ملتا جلتا سحر تھا
میں یہ کہتا ہوں کوئی اعجاز تھا یا سحر تھا　　اُس کی باتوں میں خدا ہی جانے کیسا سحر تھا
چل گئی سارے زمانہ میں ہوائے دردِ دل

سر ہتھیلی پر لیے جاتے ہیں ساماں ڈھونڈنے　　شمع ہاتھوں میں لیے نکلے شبستاں ڈھونڈنے
داغِ دل لے کر چلے جائے چراغاں ڈھونڈنے　　درد پیدا کر کے نکلی قوم درماں ڈھونڈنے
اہلِ دل جو تھا وہی تھا مبتلائے دردِ دل

بے خبر جب تھا تو یہ ہمدردیاں تھیں ناگوار　　درد کو بے درد بن کر کوستا تھا بار بار
کیا خبر تھی یہ خزاں کے بھیس میں ہوگی بہار　　دردِ دل کے میں تصدق دردِ دل کے میں نثار
شیعہ کالج کی بِنا نکلی بنائے دردِ دل

علم کے پھولوں سے بھر جائے گا داماں ایک دن　　داغِ دل بن جائیں گے اپنے گلستاں ایک دن
ہوگا ان ہاتھوں ہی سے کالج کا ساماں ایک دن　　درد بڑھتے بڑھتے بن جائے گا درماں ایک دن
عید ہوگی جب کہ ہوگی انتہائے دردِ دل

کام آئے قوم کے ہر دل میں ایسا درد دے　　قوم کی خدمت کو اُس کا بچہ بچہ چل پڑے
تو اگر چاہے تو دم میں آرزو پوری کرے　　نجم جلد آنکھوں سے یارب شیعہ کالج دیکھ لے
شافیِ مطلق ہے تو اور یہ دوائے دردِ دل

(20)

درِ یتیم

(یہ وہی نظم ہے جس نے شیعہ کانفرنس کے اجلاس ہشتم منعقدہ الہ آباد میں حشر برپا کر رہا تھا اور جس پر عالیجناب راجہ سید ابو جعفر صاحب مدظلہ العالی تعلقہ دار پیر پور (اودھ) نے ساڑھے چار ہزار روپیہ نچھاور کر دیا)

مائلِ حسرت بیانی ہے دلِ حسرت نواز　　چین سے رہنے نہیں دیتا ہے یہ سوز و گداز
تم سے کہنا ہے مجھے اک بے مزہ ہستی کا راز　　یہ سمجھ لینا نہ لیکن ہے زباں اس کی دراز
دردِ دل کی وجہ سے کچھ درد ہے آواز میں
ہاں خلل میں ڈالنے آیا ہوں خوابِ ناز میں

یوں تو برسوں ہو گئے اس طرح سے جیتے ہوئے　　سال بھر گزرا ہے لیکن خونِ دل پیتے ہوئے
ناولوں پر تو بہت کچھ آپ ہیں کہتے ہوئے　　یہ بھی سن لیں غور سے قصے جو ہیں بیتے ہوئے
شاعری نازک خیالی خوش بیانی یہ نہیں
غم زدوں کا قصۂ غم ہے کہانی یہ نہیں

سچ کہو تم کو بھی ہے کچھ اس حقیقت پر نظر　　کس کی فریادوں میں ہے صورِ قیامت کا اثر
کس کی آہوں سے لرزتا ہے فرشتوں کا جگر　　کس کی آنکھوں میں ہیں آنسو صبحِ محشر کی خبر
رنج اور غم ہم نوالے ہم پیالے کس کے ہیں
عرشِ خالق جو ہلا دیتے ہیں نالے کس کے ہیں

کس کا دل ہے وہ کہ جس میں اٹھتی ہی رہتی ہے ہوک　　رحم کے قابل ہے کس کے ساتھ قسمت کا سلوک
آسماں کرتا نہیں کس کے مٹا دینے میں چوک　　کس مپرسی میں بسر کرتی ہے کس کی پیاس بھوک
داغِ غم قلب و جگر میں دوہرے، تہرے کن کے ہیں
جو سدا اترے ہوئے رہتے ہیں چہرے کن کے ہیں

کون ہے کوئی نہیں جس نے لڑکپن کی بہار   کون ہے دیکھی نہیں جس نے کبھی ماں کی کنار
کون ہے جس نے بزرگوں کا نہ جانا لاڈ پیار   کس کو گھر پیدا نہیں ہے زیرِ جیب خرچ مدار
رات کے سونے کو فرشِ بوریا ملتا نہیں
لاڈلے بچوں میں کس کو کھیلنا ملتا نہیں

اپنے ہی دل کو چھری ہے کس کے ماتھے کی شکن   شامِ غربت سے بھی بدتر کس کی ہے صبحِ وطن
عید کے کپڑے ہیں کس کے جیسے مفلس کا کفن   کس کی خاطر ہیں جہاں میں سیکڑوں خاطر شکن
اس بھری دنیا میں کس پر مہرباں کوئی نہیں
اُن کو کیا کہتے ہیں جن کے باپ ماں کوئی نہیں

غور سے کرنا ذرا دارالیتامیٰ پر نظر   کس قدر تم سے ہی وابستہ ہیں ایسے نوحہ گر
یہ خدا جانے کہ پھرتے ہوں گے کتنے دربدر   تم سا خوش قسمت نہ ہوگا کوئی قصہ مختصر
مل گئی جنت جو ان کی سرپرستی مل گئی
ہو نصیبے کے ولی کیا جنس سستی مل گئی

مائلِ لطف و کرم تیور جو پائے آپ کے   اپنی امیدیں لیے دامن میں آئے آپ کے
کون ہے مظلوم بچوں کا سوائے آپ کے   پالنے کو غیر آئیں گے بجائے آپ کے
ان کو ہاتھوں سے نہ کھونا یہ گہر انمول ہیں
مختصر یہ ہے کہ فردوسِ بریں کا مول ہیں

صورتِ تصویر ہیں بچوں کی صورت دیکھیے   سر سے پا تک ہیں مجسم شکلِ حسرت دیکھیے
منہ سے کچھ بھی کہہ نہیں سکتے ہیں غربت دیکھیے   دیکھ کر ان کو پھر اپنی دل کی حالت دیکھیے
ڈھونڈتے ہیں ماں کا زانو دستِ شفقت باپ کا
ان کی آنکھیں غور سے منہ دیکھتی ہیں آپ کا

پوچھیے ماں باپ سے ان کے تم ان کی حسرتیں   زندگی میں ان کی ہوتیں ان کی کیا کیا چاہتیں
ان کی راحت پر تصدق کرتے اپنی راحتیں   سیکڑوں دن بھر میں ان کی مانی جاتیں منتیں
مرنے والوں پر بھی سب ناز کرتے سیکڑوں
ان کے سر سے روز شب صدقے اترتے سیکڑوں

کون اب ان کے بناؤ کا کرے ارمان وشوق　　کس کو اتنی چاہ ہوگی کس کو ہوگا اتنا ذوق
لاڈلے بچوں پہ یہ کمبخت کیا لیجائیں فوق　　ہنسلیں ہیں ان کے سینہ پہ نہ گردن میں ہیں طوق
ہوگئیں ان کے لیے قصہ کہانی منتیں
ان کے جینے کی کسی نے بھی نہ مانی منتیں

ہوگئی ہے قحط سے تعداد بچوں کی دو چند　　سال بھر سے قوم کا دستِ سخاوت بھی ہے بند
بامِ مقصد سے بہت نیچی ہے ہمت کی کمند　　شرم آتی ہے کہ رہتے ہیں یہ بیکس دردمند
آپ کے گھر ان کو ہے آرام یا تکلیف ہے
نام ہے سب آپ ہی کا آپ کی تعریف ہے

بیکسی پر ان کی روئیں کیوں نہ آنکھیں مثلِ ابر　　ان کے رہنے کے مکاں سے ہے خجل تنگیِ قبر
چین جاڑے میں کسی کو اور نہ گرمی میں ہے صبر　　آپ ہی فرمایئے کب تک اٹھائیں دل پہ جبر
کیا غضب ہے بن نہیں چکتا کہاں بننے کو ہے
مدتوں سے سنتے آتے ہیں مکاں بننے کو ہے

موسمِ گرما نہیں اب آگئے جاڑوں کے دن　　مخمل و کمخواب میں اہلِ دول ہیں مطمئن
آپ ہی بتلائیں ان کے سردی کھانے کے ہیں سن　　پوچھتا ہوں سارے شیعوں سے جواں ہوں یا مُسن
دیکھ سکتی ہے کن آنکھوں سے حمیت آپ کی
جاڑے سے بچوں کے دل کانپیں لحد ماں باپ کی

ہے انہیں آفت زدوں کے حال پر موقوف کیا　　سچ تو یہ ہے قوم کی بگڑی ہوئی ہے کچھ ہوا
منہ سے سب کچھ کہہ دیا پورا نہ کچھ بھی ہوسکا　　ہے نشاں اسکول کا اب تک نہ کالج کا پتا
کس لیے اغیار کو ہنسنے کا موقع دیجیے
بات جب منہ سے نکالی ہے تو پوری کیجیے

مدتوں غفلت رہی اب ہوش میں بھی آیئے　　جھوٹ کہتا ہوں اگر سو مرتبہ جھٹلایئے
کام کیا ابتک کیے ہیں قوم نے گنوایئے　　پچھلے سالوں جو رہی وہ بات ہی فرمایئے
کیا تماشا ہے نیا ہر روز غم ہوتا رہے
جس قدر دن بڑھتے جائیں جوش کم ہوتا رہے

جو ارادہ ہے وہ اس اجلاس تک محدود ہے
آپ یاں جب تک ہیں دل میں جوش بھی موجود ہے
جب نتیجہ کچھ نہیں بیکار ہے بے سود ہے
عود جب خوشبو نہ دے ہیزم ہے وہ یا عود ہے
جانِ شیریں تک مٹا دیں گے یہ تہیہ کر گئے
یاد پھر کچھ بھی نہیں رہتا جب اپنے گھر گئے

ایک مرکز پر کوئی شیعہ نہیں یہ حال ہے
کچھ نیا انداز ہے اور کچھ پُرانی چال ہے
قوم کے کاموں میں بھی مطلب کی قیل و قال ہے
روٹیوں کے ساتھ ساتھ اخلاص کا بھی کال ہے
قوم کے برباد کرنے کا ذریعہ رہ گئے
بات کہنے کی نہیں کہنے کے شیعہ رہ گئے

ہیں کچھ اپنی قوم میں ایسے امیرانِ اجل
ساری دنیا سے نرالا جن کا ہے طرزِ عمل
کام میں اغیار کے دیتے ہیں چندہ بے محل
قوم سے تنگی ہے وہ اوروں سے ہیں دست و بغل
چھوڑ کر اپنوں کو غیروں کے معاون بن گئے
اس قدر چندے دیے اسکول کالج بن گئے

چھوڑتی ہے ان کا پیچھا کب خطابوں کی ہوس
جتنی دولت ہے اسی میں صرف ہو جاتی ہے بس
آنریبل ہوں کہیں یہ آرزو ہے ہر نفس
جان بھی جائے تو اس میں کچھ نہ ہوگا پیش و پس
اس سے مطلب ہی نہیں ہے قوم کا کچھ کام ہو
اپنی عزت ہو جہاں میں نام ہو آرام ہو

آپ کی بے اعتنائی کی جو یہ حالت رہی
آخرش عہدے سے مستعفی ہوئے ہیں سیکرٹری
بن رہی تھی جو مسلمانوں کی یونیورسٹی
اس میں جو چندہ دیا آتا وہ اپنے کام ہی
مفت یہ نقصان اُٹھایا کچھ نتیجا بھی ہوا
کب کی ٹھنڈی ہو چکی وہ مر کے تیجا بھی ہوا

کہتے کہتے قصۂ غم ہو گیا مطلب سے دور
ان امیرانِ ستم کا حال کہنا تھا ضرور
جی میں جو آئے وہ کہیے پر یہ سُن رکھیے حضور
صاف کہتا ہوں خطا اس کو سمجھیے یا قصور
دل جلوں کا نالۂ غم رائگاں ہوتا نہیں
یا زمیں ہوتی نہیں یا آسماں ہوتا نہیں

69

ان میں سید ہیں بہت سے ان کی عزت کیجئے　　ان کی وقعت کیجئے ان سے محبت کیجئے

سرخرو پیش نبیؐ جانے کی صورت کیجئے　　اپنے بچوں سے زیادہ ان سے الفت کیجئے

یہ سمجھ لیجے کہ ہیں ماں باپ سے چھوٹے ہوئے

ان کی ہمت بار مے دل ان کے ہیں ٹوٹے ہوئے

دیکھئے کیا کر کے رہتا ہے یہ تیرا اضطراب　　تیری باتیں بھی ہیں نشتر اور دل خانہ خراب

ان کے کانوں تک تو پہنچی پر نہ پایا کچھ جواب　　کیا خبر تیری صدا ہوگی نہ ہوگی کامیاب

کیا قیامت ہے کہ کوئی منچلا بڑھتا نہیں

دستِ سائل بڑھ چکا دستِ سخا بڑھتا نہیں

قوم کے ہاتھوں میں زر اور دل میں ہمت دے خدا　　نجم بس خاموش اب خالق سے یہ کرلو دعا

ہو کسی صورت دلِ محزوں کا پورا مدعا　　عرش کے پایہ کو چومے آج آہِ نارسا

شمع مقصد کے ہوں پروانے جواں بھی پیر بھی

آکے لگ جائے گلے تدبیر کے تقدیر بھی

(21)

نقدِ دل

(یہ وہ نظم ہے جو سارے ملک سے خراج تحسین وصول کرچکی ہے جو شیعہ کالج فاؤنڈیشن کمیٹی لکھنؤ میں پڑھی گئی تھی اور راجہ ابوالحسن صاحب بہادر والی ملیرانے دوسو روپیہ میں خرید فرمائی تھی۔)

اے چمن زارِ جہاں اے لکھنؤ کی سرزمیں رشکِ جنت کیوں نہ کردے تجھ کو جنت آفریں
یہ ترا پُر شوق دامن اور یہ بزمِ حسیں زیب کرسیِ صدارت صاحب تاج و نگیں
جو کبھی دیکھے نہوں اب وہ نظارے دیکھ لے
چرخ سے کہدے ہمارے چاند تارے دیکھ لے

ہم سے دیوانوں سے بھی واقف ہے او محفل طراز کچھ ہمارے نالۂ رنگیں سے بھی ہے ساز باز
یاد ہیں کچھ اگلی باتیں بھی تجھے او بحرِ ناز تجھ کو بھولا تو نہ ہوگا وہ ہمارا سوز و ساز
وقف کردی تھی رگِ جاں ہم نے خنجر کے لیے
دل کے ٹکڑے لے کے آئے تھے نچھاور کے لیے

لیکے پہنچا پھر الٰہ آباد میں جوشِ جنوں ہم نے سینہ چیر کر دکھلا دیا سوزِ دروں
شوخ نالوں نے نہ چھوڑا بزم میں صبر و سکوں ہوگئی پر بیقراری اور اُس دن سے فزوں
یہ خلش پیدا ہوئی آخر دلِ بے حال میں
اب تمنا پڑھنے کی ہے شیعہ کالج ہال میں

وہ ہمارا شیعہ کالج وہ ہمارا مدعا وہ ہماری قوم کی آنکھوں کا تارا مدعا
وہ ہماری زندگانی کا سہارا مدعا چٹکیاں لیکر یہ کرتا ہے اشارہ مدعا
ان کو کیا مشکل ہے کالج بندہ پرور کھولنا
جن کے مولاؑ کو ہو آساں بابِ خیبر کھولنا

ہو نہ جب تک کامیابی ہم نہ بیٹھیں گے نچنت — اس میں جھگڑا ہو زمیں سے یا فلک سے ہو لڑنت
منہ پہ آجاتی ہے جب ہم بات کہہ دیتے ہیں تنت — درد دل اپنا نہیں ہے ساحروں کی سی پڑھنت
نالے اس پر تُل گئے ہیں حشر اُٹھا کر جائیں گے
دل یہ مچلا ہے کہ ہم کالج بنا کر جائیں گے

پیرو حیدرؑ ہیں ہم رکھتے ہیں اخلاق حسن — مرتے مرتے بھی دکھا دیں گے بزرگوں کا چلن
لاکھ مٹ جائیں نجائے گا مگر وہ بانکپن — مفلسی میں ہیں غنی اتنے بہ فضلِ پنجتن
اب بھی کر جائیں اگر ہمت تو اگلے سال تک
پانچ کالج کھول دیں پنجاب سے بنگال تک

ایک ہو جائیں جو دو دل توڑ دیتے ہیں پہاڑ — یاں ہزاروں باغباں ہیں پھر بھی گلشن ہے اُجاڑ
پست ہمت ہیں سمجھتے ہیں جو قسمت کا بگاڑ — دیکھئے کہتا ہے کیا دل سے تو کیجئے چھیڑ چھاڑ
آپ کا معیار ہے باتیں بہت سی کام کم
اصل یہ ہے جمع ہیں وعدے زیادہ دام کم

آج بھی گر رہ گئی ایثار قومی میں کمی — خون رلوائے گی ساری عمر غیروں کی ہنسی
بات جو کانٹے کی تھی وہ آپ سے کہہ دی گئی — آپ نے اب بھی اگر کردی سُنی کی ان سُنی
پھر کبھی اس طرح سے محفل جمائی جائے گی
یہ تو کہیے آنکھ دنیا سے ملائی جائے گی

واہ کیا کہنا ہے جو پیرو ہیں باب علم کے — آج وہ دنیا میں ترسیں ایک کالج کے لیے
ہم نے مانا صاحب علم آپ کے اسلاف تھے — آپ بھی کچھ چیز ہیں اپنی طرف تو دیکھئے
اُن کے دل بڑھتے تھے ہاتھوں یاں قدم بڑھتے نہیں
وہ پڑھاتے تھے جہاں کو آپ خود پڑھتے نہیں

ان کی بھی ہستی ہے کچھ اک مدرسہ جن کا نہ ہو — کیوں ہنسے اُن پر نہ دنیا ان کا کیوں ٹھٹھا نہ ہو
ہو بزرگوں کی کہانی لب پہ ذکر اپنا نہ ہو — باپ سے نسبت ہے کیا بیٹا اگر ویسا نہ ہو
دن گئے وہ پوچھتے تھے جب کہ تھے اسلاف کیا
اب زمانہ دیکھتا یہ ہے کہ ہیں اخلاف کیا

(21)

نقدِ دل

(یہ وہ نظم ہے جو سارے ملک سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے جو شیعہ کالج فاؤنڈیشن کمیٹی لکھنؤ میں پڑھی گئی تھی اور راجہ ابوالحسن صاحب بہادر والی ملیرا نے دو سو روپیہ میں خرید فرمائی تھی۔)

اے چمن زارِ جہاں اے لکھنؤ کی سرزمیں
رشکِ جنت کیوں نہ کردے تجھ کو جنت آفریں

یہ ترا پُرشوق دامن اور یہ بزمِ حسیں
زیبِ کرسی صدارت صاحبِ تاج و نگیں

جو بھی دیکھے نہوں اب وہ نظارے دیکھ لے
چرخ سے کہدے ہمارے چاند تارے دیکھ لے

ہم سے دیوانوں سے بھی واقف ہے او محفل طراز
کچھ ہمارے نالۂ رنگیں سے بھی ہے ساز باز

یاد ہیں کچھ اگلی باتیں بھی تجھے او محوِ ناز
تجھ کو بھولا تو نہ ہوگا وہ ہمارا سوز و ساز

وقف کر دی تھی رگِ جاں ہم نے خنجر کے لیے
دل کے ٹکڑے لے کے آئے تھے نچھاور کے لیے

لیکے پہنچا پھر الہٰ آباد میں جوشِ جنوں
ہم نے سینہ چیر کر دکھلا دیا سوزِ دروں

شورِ نالوں نے نہ چھوڑا بزم میں صبر و سکوں
ہوگئی پر بیقراری اور اُس دن سے فزوں

یہ خلش پیدا ہوئی آخر دلِ بے حال میں
اب تمنا پڑھنے کی ہے شیعہ کالج ہال میں

وہ ہمارا شیعہ کالج وہ ہمارا مدعا
وہ ہماری قوم کی آنکھوں کا تارا مدعا

وہ ہماری زندگانی کا سہارا مدعا
چٹکیاں لیکر یہ کرتا ہے اشارہ مدعا

ان کو کیا مشکل ہے کالج بندہ پرور کھولنا
جن کے مولا کو ہو آساں بابِ خیبر کھولنا

ہو نہ جب تک کامیابی ہم نہ بیٹھیں گے نچنت　　اس میں جھگڑا ہو زمیں سے یا فلک سے ہو لڑنت
منہ پہ آجاتی ہے جب ہم بات کہہ دیتے ہیں تنت　　دردِ دل اپنا نہیں ہے ساحروں کی سی پڑھنت

نالے اس پر تُل گئے ہیں حشر اُٹھا کر جائیں گے
دل یہ مچلا ہے کہ ہم کالج بنا کر جائیں گے

پیرو حیدرؑ ہیں ہم رکھتے ہیں اخلاقِ حسنؑ　　مرتے مرتے بھی دکھا دیں گے بزرگوں کا چلن
لاکھ مٹ جائیں نجائے گا مگر وہ بانکپن　　مفلسی میں ہیں غنی اتنے یہ فضلِ پنجتنؑ

اب بھی کر جائیں اگر ہمت تو اگلے سال تک
پانچ کالج کھول دیں پنجاب سے بنگال تک

ایک ہو جائیں جو دو دل توڑ دیتے ہیں پہاڑ　　یاں ہزاروں باغباں ہیں پھر بھی گلشن ہے اُجاڑ
پست ہمت ہیں سمجھتے ہیں جو قسمت کا بگاڑ　　دیکھئے کہتا ہے کیا دل سے تو کیجئے چھیڑ چھاڑ

آپ کا معیار ہے باتیں بہت سی کام کم
اصل یہ ہے جمع ہیں وعدے زیادہ دام کم

آج بھی گر رہ گئی ایثار قومی میں کمی　　خون رلوائے گی ساری عمر غیروں کی ہنسی
بات جو کانٹے کی تھی وہ آپ سے کہدی گئی　　آپ نے اب بھی اگر کردی سُنی کی ان سُنی

پھر کبھی اس طرح سے محفل جمائی جائے گی
یہ تو کہیئے آنکھ دنیا سے ملائی جائے گی

واہ کیا کہنا ہے جو پیرو ہیں بابِ علم کے　　آج وہ دنیا میں ترسیں ایک کالج کے لیے
ہم نے مانا صاحبِ علم آپ کے اسلاف تھے　　آپ بھی کچھ چیز ہیں اپنی طرف تو دیکھئے

اُن کے دل بڑھتے تھے ہاتھوں یاں قدم بڑھتے نہیں
وہ پڑھاتے تھے جہاں کو آپ خود پڑھتے نہیں

ان کی بھی ہستی ہے کچھ اک مدرسہ جن کا نہ ہو　　کیوں ہنسے اُن پر نہ دنیا ان کا کیوں ٹھٹھا نہ ہو
ہو بزرگوں کی کہانی لب پہ ذکر اپنا نہ ہو　　باپ سے نسبت ہے کیا بیٹا اگر ویسا نہ ہو

دن گئے وہ پوچھتے تھے جب کہ تھے اسلاف کیا
اب زمانہ دیکھتا یہ ہے کہ ہیں اخلاف کیا

تجھ کو کچھ سودا ہُوا ہے او دلِ حسرت پسند   ضبط کی طاقت نہیں اب بند کر یہ وعظ و پند
درد مندوں کو نہیں کرتے زیادہ درد مند   چشمِ باطن سے دکھا دی وہ عمارت سر بلند
دور یہ پژمردگی ہو دل میں جوش آنے لگے
چشمِ ظاہر بند ہو جائے تو ہوش آنے لگے

وہ کھلا کالج ہوا فضلِ خدائے لایزال   کہہ کے بسم اللہ پڑھنے کو چلے شیعوں کے لال
شوق بھی بڑھتا گیا جوں جوں بڑھے وہ خُرد سال   کوششوں میں کامیابی کی گزارے ماہ و سال
فارغ التحصیل ہو کر پار کشتی ہو گئی
یا علی کہہ کر نکل آئے کہ چھٹی ہو گئی

ہوگا یہ کالج ہمارا مخزنِ علم و ہنر   مذہبی تعلیم ہو گی فرض طالب علم پر
ہم بنائیں گے اسے تہذیبِ اسلامی کا گھر   ہر جبیں پر شوکتِ اسلام ہو گی جلوہ گر
ساتھ دنیا کے رہے گا دینِ حق کا پاس بھی
مولوی فاضل بھی ہوں گے اس میں ایم اے پاس بھی

شیعہ کالج دیکھ او آمادۂ بزمِ جہاں   تیری خاطر جمع ہیں کیا کیا گلِ نورس یہاں
آج ہے جذبِ محبت کا بڑا سخت امتحاں   تجھ کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں چھپ رہا ہے تو کہاں
رونمائی تیری دے کر شکلِ زیبا دیکھ لے
آ تصور بن کے دل میں قوم نقشا دیکھ لے

تو نہ محتاجِ سفارش ہے نہ محتاجِ وکیل   پیاری پیاری تیری صورت آپ کر لے گی اپیل
سب یہ پیرو ہیں نبی کے یاں نہیں کوئی بخیل   تو تو پھر اپنا ہے یہ غیروں کے ہوتے ہیں کفیل
بن پڑی ہے آج جو کچھ ہے گرہ میں کھول لے
یہ سمندر ہیں سمندر ان سے موتی رول لے

چاہیے مردم شناسی بھی مگر اے خوش صفات   آدمی لاکھوں کے جو ہیں اُن سے کر لاکھوں کی بات
اُن کے آگے ہیں ہزاروں سیکڑوں کیا کائنات   ہم غریبانِ ازل سے جو بھی کچھ آ جائے ہات
کچھ طبیبِ قوم آئے ہیں دوائیں ان سے لے
کچھ خدا کے خاص بندے ہیں دعائیں ان سے لے

دیکھنا یہ ہے کہ ہے کس کو جدائی تیری شاق　　کون ہے سب سے سوا ہے جس کو تیرا اشتیاق
کس کے سینہ کو جلاتا ہے ترا سوزِ فراق　　کون میدانِ وفا میں آج نکلا چست و چاق
آج یہ کھل جائے گا ہے تجھ پہ شیدا کون کون
سب ہی کہنے کو ہیں تیرے پر ہے تیرا کون کون

بزم میں راجہ بھی ہیں نواب بھی سردار بھی　　تیری قسمت سے ہیں زیب انجمن سرکار بھی
فضلِ حق سے اہلِ دل بھی ہیں ترے غمخوار بھی　　نقدِ دل لائے ہیں ہم سے مفلس و نادار بھی
آئے ہیں امداد دینے جان سے اور مال سے
سندھ سے پنجاب سے مدراس سے بنگال سے

ہے یہ آغاز زمانہ سے زمانہ کا چلن　　جان دیتے ہیں وطن پر اپنے اپنے مرد و زن
تیرے قدموں کی قسم یہ ہے فقط دیوانہ پن　　جو وطن کی لاج رکھ لے ہے اُسے حبِّ وطن
بات اک نکتہ کی کہہ دی ختم قِصّا ہوگیا
عقلمندوں کے لیے کافی اشارہ ہوگیا

نجم اب دل میں نہیں ہے ضبط کی طاقت ذرا　　تو نے وہ نالے کیے منہ کو کلیجہ آگیا
قوم سے کہہ دے کہ یہ باتیں زبانی تا کجا　　گونج جائیں نعرۂ صلوٰۃ سے ارض و سما
نام باب علم لے کر کھول دے کالج کا باب
یا علیؑ یا ایلیاؑ یا باالحسنؑ یا بوترابؑ

(22)

ہماری عید

عید کو کیا کہیئے ہرجائی ہے عید اک سرے سے سب کے گھر آئی ہے عید
تو بہت جوبن پہ اترائی ہے عید سال بھر میں شکل دکھلائی ہے عید
دوستی کیا تیری او بے دید الگ
یاں ہر اک کی عید ہے اے عید الگ

زاہدوں کی عید ہے یادِ خدا عالموں کی عید شہرہ علم کا
اہلِ دل کی عید ہے جود و سخا عید جانبازوں کی خنجر اور گلا
بے وطن کی کیا کہوں کیا عید ہے
جب وطن میں پھر کے آیا عید ہے

رند کو پینے کی پلوانے کی عید واعظوں کو وعظ فرمانے کی عید
سوئے کعبہ شیخ کو جانے کی عید نجد میں لیلےٰ کے دیوانے کی عید
عید گہ اک کوچۂ دلدار ہے
عاشقوں کی عید وصلِ یار ہے

عید بچوں کی ہے اچھا پیرہن بلبلوں کی عید ہے رنگیں چمن
شاعروں کی عید تعریفِ سخن ہے نئے دولہا کی عید اس کی دلہن
رشک کے قابل ہے پروانے کی عید
شمع پر ہے جل کے مرجانے کی عید

مسکنوں کی عید گنج و مال میں صوفیوں کی بزم حال و قال میں
عید امیروں کی دو شالے شال میں بے نوا کی عید اس کی کھال میں
اپنی اپنی سب کو پیاری عید ہے
ہم بھی کہہ دیں جو ہماری عید ہے

ہم ہیں محو آہ و زاری عید کیا   دین کی ہوتی ہے خواری عید کیا
ہم سے کرتی دوستداری عید کیا   وقفِ حسرت ہیں ہماری عید کیا
غم نہ شادی کوئی مونس ہی نہیں
اب دلِ ناشاد میں جس ہی نہیں

ہے بہت اسلام اب زار و نزار   شاق ہے اے مہدیِ دیں، انتظار
یہ ہماری عید ہے اے شہریار   کہہ رہا ہے دل بھی دیوانہ وار
عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو
انبساطِ عید دیدن روئے تو

(23)

ترانۂ عید

جن و بشر ہیں شادماں کون و مکاں میں عید ہے   عیدِ غدیر کے نثار سارے جہاں میں عید ہے
بلبلیں سب ہیں نغمہ خواں حوروں کو عیش جاوداں   باغِ جہاں میں عید ہے قصرِ جناں میں عید ہے
صدقے نہ کیوں ہوں دل جگر عید ہے پنجتن کے گھر   شاد ہیں اُمتی تمام پیر و جواں میں عید ہے
عید دلِ رسولؐ میں عید دلِ بتول میں   جس کا مکاں ہے لامکاں اُسکے مکاں میں عید ہے
عید ہے دشت و در میں آج عید ہے بحر و بر میں آج   رقص میں ہیں حباب نہر آبِ رواں میں عید ہے
کیوں نہ ہوں خوش جوان و پیر تو ہو جو یا علی امیر   مست ہیں سب ترے فقیر بزمِ شہاں میں عید ہے
قیدِ مرض سے ہوں تباہ مجھ پہ ہو یا علی نگاہ   وعدہ مدد کا کیجئے آپ کی ہاں میں عید ہے
شکرِ خدا میں دم بدم سجدہ میں ہے مرا قلم
میری زباں کو نجم آج کام دو ہاں میں عید ہے

(24)

تمنا

قضا کا کیا ٹھکانا زندگی کا کیا بھروسا ہے
خیالوں میں ابھی محدودیاں کالج کا نقشا ہے
جدھر بھی دیکھتا ہوں یاس کی صورت ہویدا ہے
جسے بھی دیکھتا ہوں نقش اک مٹتا ہوا سا ہے
وہ اک تصویر ہے عبرت کی دل میں جو تمنا ہے

ہوئی جاتی ہے کشتی دور آ کر پاس ساحل کے
وہ جوشِ ابتدائی ہو گیا رخصت گلے مل کے
کچھ ایسی چپ لگی ہے ہونٹ گویا رہ گئے سل کے
سحر ہوتے ہی یہ کیا ہو گئے آثار محفل کے
نظر کرتا ہوں جس چہرہ پہ کچھ اترا ہوا سا ہے

یہ ذلت قوم کی یہ خواریاں دیکھی نہیں جاتیں
ہنسی غیروں کی اور ناچاریاں دیکھی نہیں جاتیں
نہ ہوں جو دل سے وہ تیاریاں دیکھی نہیں جاتیں
میں رو دیتا ہوں یہ غمخواریاں دیکھی نہیں جاتیں
کلیجہ بیٹھ جاتا ہے جو دل میں درد اٹھتا ہے

یہ کیسا رنگ بدلا ہے اسی حیرت میں بیٹھا ہوں
کہاں وہ شورا شوری اور کہاں یہ بے نمک مضموں
بہایا جائے گا کب تک ہماری حسرتوں کا خوں
تجھے اس کا بھی کچھ احساس ہے اے گردشِ گردوں
الٹ جاتے ہیں دل کتنے زمانہ جب پلٹتا ہے

نہیں ممکن جو اس دشوار رستہ سے گزر جاتا
نہیں آتا اگر ہاتھوں پہ رکھ کر اپنا سر جاتا
بنا پائے نہ اک کالج اسی میں نام کر جاتا
کسی امید پر جیتا کسی حسرت میں مر جاتا
یہی جینے میں جینا ہے یہی مرنے میں مرنا ہے

ہمیں اس جوشِ وقتی نے کیا دل کھول کر رسوا
جو کر سکتے نہ تھے اس کو زباں سے کیوں نکالا تھا
کسی کے پاس کیا بیٹھیں کسی کو منہ دکھائیں کیا
مقدر نے ہمیں کو لائقِ محفل نہیں رکھا
وہی اگلی سے محفل ہے وہی پہلی سی دنیا ہے

یہ کشافِ حقیقت ہیں سبق آموز عبرت ہیں
ہر اک مصرع میں پوشیدہ ہزاروں رازِ حکمت ہیں
زمانہ محوِ حیرت ہے یہ بھبتیں ہیں قیامت ہیں
تمہارے شعر کیا ہیں مجسم پیغامِ محبت ہیں
غزل کیا ہے تمہاری حسرتوں کی ایک دنیا ہے

(25)

ارمغانِ اتحاد

کیوں نہ دل میں گھر کرے لطفِ بیانِ اتحاد
پیاری پیاری میٹھی میٹھی ہے زبانِ اتحاد

قوم کا نام و نشاں نام و نشانِ اتحاد
قوم کا سود و زیاں سود و زیانِ اتحاد

اس کا مسلک صلح کل ہے اس کا مقصد اتفاق
کون دنیا میں نہیں ہے قدر دانِ اتحاد

دھوتیں اہلِ نظر کی ہیں یہ گھر بیٹھے ہوئے
سب کے گھر جاتا ہے امرد ہہ سے خوانِ اتحاد

کس دھڑلے سے یہ کرتا ہے وکالت قوم کی
بے زبانی پر بھی اتنی ہے زبانِ اتحاد

ہے یہ اندازِ تغافل اُس کی خدمت کا صلہ
ہاتھ تو رکھیں دلوں پر قدر دانِ اتحاد

ہو فروغِ حُسن یا رب غیرتِ شمس و قمر
ہوں ستاروں سے زیادہ عاشقانِ اتحاد

سچ تو ہے بیکار ہے گر تیغ میں جوہر نہوں
جوہری کہتے ہیں سب جوہر ہیں جانِ اتحاد

اس سے بہتر تجم دنیا میں کوئی تحفہ نہیں
دوست بھیجیں دوستوں کو ارمغانِ اتحاد

(26)

ترانۂ اتحاد

دلِ عالم تو تھا ہی معترف حسنِ معانی کا
بہت بھائیں نگاہوں کو یہ خوش پوشاکیاں تیری

مبارک ہو نیا جوڑا بدلنا اے حسیں تجھ کو
ادائیں ہو گئی ہیں اور بھی اب دلستاں تیری

یہ ذوقِ مستقل تیرا یہ شوقِ مستعد تیرا
یہ وضع خوشنما تیری یہ خوش ترکیباں تیری

جگا دے بختِ خفتہ کو جلا دے قومِ مردہ کو
مسیحائی دکھا دیں آج میٹھی بولیاں تیری

تری دلسوزیاں وقفِ تغافل ہو نہیں سکتیں
دلوں پر قوم کے لکھی ہوئی ہے داستاں تیری

ہمارے دل میں تو نے روح پھونکی ہے اخوت کی
ہماری نا خدا ہے کشتیٔ عمرِ رواں تیری

ہر اک گوشِ دل میں ہند کے ایک ایک گوشہ میں
سنا آئیں نوا کالج کی خوش آوازیاں تیری

نہ ہو کیوں نیک نام ایسا کہ ہے نامِ اتحاد آخر
ازل سے دہر میں مانی ہوئیں ہیں خوبیاں تیری

ثمر دیکھے گا تو محنت کا اپنی اپنی آنکھوں سے
کسی دن ہوں گی کالج ہال میں مہمانیاں تیری

بہت کم رہ گئے ہیں دن بنائے مقصدِ دل کے
لقائے زریں ہے کیوں سُست قدم اے مہرباں تیری

اٹھا دے یا علی کہہ کر انہیں بیٹھے ہوں دل جن کے
فلک کے پار جاتے ہم نے دیکھی ہے فغاں تیری

نہ گھبرائے گئے سختی کے دن اب قوم سے کہہ دے
کبھی آرام جاں ہوں گی یہی جانکاہیاں تیری

ادھر رکھے ہز آنر کا کرم بنیاد کا پتھر
لڑا دیں جان ادھر تکمیل میں پامردیاں تیری

حصولِ علم داخل ہے فرائض میں اوامر میں
رہیں وقفِ نواہی اب تغافل کیشیاں تیری

کریں گے جب غلاموں کی مدد بابِ علوم آکر
یہ تیری مشکلیں ہو جائیں گی آسانیاں تیری

بھلا پھر بھی کوئی دشوار ہے کیسوں کا منہ کھلنا
جو ہمت قوم کی ہو ترجم کے شعر اور زباں تیری

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر میخواں چو محمل را گراں بینی

(27)

تہید ستانِ قسمت

نہ بڑھ حد سے زیادہ گرمیِ جوشِ وفا دم لے
کمر تک جا کے ہوگی دستِ ہمت کو پشیمانی

کہاں وہ دن کہ تھا ایک ایک مستِ بادۂ جرأت
موافق اب تو برسوں سے نہیں تلوار کا پانی

کمانیں ہیں کشیدہ بھاگتے ہیں تیر اب کوسوں
مثالِ مجرماں روپوش ہے گرزِ نریمانی

نگاہیں ہوگئیں نا آشنا شمشیرِ برّاں سے
نظر آتی نہیں اب خواب میں خنجر کی عریانی

نہ تھا خود اُن کے ہی کانوں کو خوش آیند یہ نغمہ
ہوئی مدت رجز خوانی سے بدلی مرثیہ خوانی

کبھی جو دستگیرِ خلق تھے وہ ہاتھ خالی ہیں
مقدر نے بنا رکھا ہے اک تصویرِ حیرانی

عصا کیسا عصائے آہ بھی معدوم ہے اب تو
اُٹھے کس کے سہارے سے الٰہی دردِ پنہانی

کسی کا جوشِ جرأت ضبط بن کر اب گلا گھونٹے
اُتارے اپنا غصہ اپنے اوپر چینِ پیشانی

تہید ستانِ قسمت وائے حسرت نذر کیا لائیں
کمر سے تیغ ہی جن کے بندھی ہے اور نہ ہمیانی

(28)

ترقی کا راز

ایسے نازک وقت میں اللہ یہ کس کی ہے بزم
سوز کے بدلے جہاں اہنگ صدائے ساز ہے

خوابِ غفلت سے کسی کی آنکھ کھلتی ہی نہیں
چشمِ مردم بھی کسی کافرادا کا راز ہے

لینے والے لے چکے دنیا کی حالت سے سبق
گلشنِ عالم میں جو ہے مائلِ پرواز ہے

اس چمن میں ہے مگر چھایا ہوا رنگِ قدیم
کچھ نیا انداز ہے بھی تو بُرا انداز ہے

سب کو یاں گھیرے ہوئے ہے خود پسندی کی بلا
اپنی اپنی راگنی ہے اپنا اپنا ساز ہے

اپنا اپنا ذکر لب پر اپنی اپنی دل میں فکر
حشر تو آیا نہیں پر حشر کا انداز ہے

کہنے والے کہہ گئے اور اب بھی کہتے ہیں بہت
سننے والے کے لیے بابِ نصیحت باز ہے

اختلاف آرا کا ترک، خود پسندی کھوئے گا
ساری قوموں کی ترقی کا یہی اک راز ہے

دوسرے کی اپنی دُھن کے آگے پر سنتا ہے کون
اک متاعِ کس مپرسی مجمع کی آواز ہے

(29)

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ایک دن ایک دوست سے میں نے کہا
کیا گزرتی ہے تمہیں بتلائیں کیا

غم کے تیروں سے کلیجہ چھن گیا
دل میں کتنے داغ ہیں دکھلائیں کیا

زخمِ کہنہ پہ ہے روز اک زخمِ نو
چارہ سازی چارہ گر فرمائیں کیا

ہے یہ پُر آشوب دنیا آج کل
آفتیں ہیں سینکڑوں بتلائیں کیا

اک بلائے قحط ہے اک دیوِ جنگ
ان سے بازی آدمی لے جائیں کیا

نالہ ہائے بیکساں کب تک سُنیں
دل کسی سے مانگ کر لے آئیں کیا

کوئی کہتا ہے پہننے کو نہیں
کوئی کہتا ہے کہ یارو کھائیں کیا

آج کل وقفِ فغاں ہیں کام و لب
اب ہوا اس بھیروں کے گائیں کیا

ہوگا اس شورش کا آخر کیا مآل
دل کو کچھ سمجھایئے سمجھائیں کیا

کیا جوابِ خشک دے کر چل دیئے
آپ فہمیدہ ہیں خود سمجھائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں ہفت آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

(30)

اسلامی فرقے

ہرج ہے کچھ جو رکھیں دل کے عقاید دل میں
کام دنیا کا تو کرتے رہیں مل کر فرقے

یا کرلو عجز کے نشاں اپنا مٹا دیں بالکل
یہ بھی کچھ فرض ہے پھوڑا ہی کریں سر فرقے

اک زمانے نے لیا رنگ سے دنیا کے سبق
پر نہ سمجھے تو نہ سمجھے یہ بہتر فرقے

روئیے انجم بھلا بیٹھ کے کس کے آگے
لاکھ چیخا کرو سنتے ہی نہیں پر فرقے

حیف اس پر بھی نہ چین آئے مسلمانوں کو
ایک اسلام کے ہو جائیں تہتر فرقے

(31)

نالۂ انجم

ہم بھی تھے کبھی قابلِ تعظیم جہاں میں
کرسی تھی کبھی عرش کی رفعت کے برابر

رکھتے تھے مسلمان سب آپس میں محبت
تھے دور میں ساغرِ عشرت کے برابر

ہم تھے وہ بشر جمع تھیں سب خوبیاں ہم میں
پھٹکی نہ برائی کبھی نیت کے برابر

ملتا تھا نہ ڈھونڈھے سے نشاں خود غرضی کا
سینے پڑھے جاتے تھے اخوت کے برابر

مفلس پہ تونگر کو نہ دی جاتی تھی ترجیح
اس وقت غریبی تھی امارت کے برابر

ناقوس ہو یا سنکھ ہو آوازہ کسی کا
پہنچاتا اذاں اور اقامت کے برابر

تھا بُعد نہ کچھ مشرق و مغرب کا نظر میں
ہم سال کو سمجھا کئے ساعت کے برابر

افریقہ میں امریکہ میں یورپ میں جہاں میں
ہم ڈنکے بجا آئے شریعت کے برابر

پہنچا دیئے ہر ملک میں تکبیر کے نعرے
رکھے تھے جو سینوں میں امانت کے برابر

پڑھ آئے سمندر کے بھی اُس پار نمازیں
اُڑ اُڑ کے گئے پھولوں کی نکہت کے برابر

ٹکرا دیں پہاڑوں سے نمازوں کی صدائیں
تھا شورِ اذاں شورِ قیامت کے برابر

اک اک بُتِ بے پیر سے پڑھوا دیا کلمہ
ہر بات تھی اعجاز و کرامت کے برابر

بیٹھے جو کہیں جا کے بٹھا دیتے تھے سکے
اُٹھتے تھے تو ہوتے تھے قیامت کے برابر

دریا کی طرح فیض تھا غیروں پر بھی جاری
تھی وسعتِ دل خلق کی وسعت کے برابر

آتا تھا جہاں علم و ہنر سیکھنے ہم سے
یاں درس دیئے جاتے تھے حکمت کے برابر

مہمان نوازی میں تھا یکتائے زمانہ
دریا بھی نہ تھا اپنی طبیعت کے برابر

تعلیم کی تحصیل کے عاشق تھے ہم ایسے
تکلیف کو سمجھا کئے راحت کے برابر

دل بستگی ایسی تھی ہمیں علم و ہنر سے
چاہا کئے محبوب کی چاہت کے برابر

ہم ہیں وہ زمانہ کو ادب ہم نے سکھایا
احسان ہیں دنیا پہ افادت کے برابر

ایجادیں ہوئی ہیں انہیں ہاتھوں سے ہزاروں
جرمن کی اور امریکہ کی صنعت کے برابر

حل ہم نے کئے سینکڑوں پیچیدہ مسائل
ہر طبع نہ تھی اپنی طبیعت کے برابر

اس عہد میں ہیں خواب فراموش یہ باتیں
وقعت ہے فقط حرف و حکایت کے برابر

احسان کے بوا بوجھ اب اُٹھتا نہیں اُن سے
جو بار اُٹھاتے تھے شہادت کے برابر

اغیار اُڑا لے گئے سب علم کے موتی
ہر ہفت اقالیم کی دولت کے برابر

ایمان کا اخلاص کا اب نام نہیں ہے
دل ہو گئے کالے شبِ فرقت کے برابر

دیکھے ہیں انہیں آنکھوں نے اسرار فلک کے
جاتا نہیں اب مرغِ نظر چھت کے برابر

عنقا ہیں مسلمانوں میں اب نیک خصائل
یہ باغ ہوا وادیٔ وحشت کے برابر

یک سوئی ہے دل کو نہ زبانوں میں اثر ہے
کیا پہنچے دعا بابِ اجابت کے برابر

شرم آتی ہے اب مَس بھی نہیں علم ادب سے
کیا بیٹھئے اربابِ فضیلت کے برابر

اب بھائی کو بھائی کی ترقی سے حسد ہے
غیروں سے تو ہے رشک عداوت کے برابر

ہر کام میں اغیار کے محتاج ہوئے ہیں
ہستی ہے فقط مٹی کی مورت کے برابر

اب سیکھتے ہیں ان سے مگر پھر نہیں آتا
آسان بھی ہے کام مصیبت کے برابر

اللہ، ہمیں دیکھ کے ہنستا ہے زمانہ
پی جاتے ہیں ہم اشک ندامت کے برابر
محنت سے تنفر ہے ریاضت سے تکدر
نظروں میں کوئی شے نہیں راحت کے برابر
کچھ علم سے مطلب ہے نہ ہے کام ہنر سے
گھر اپنا بنایا ہے جہالت کے برابر
قرآن و احادیث کو چھونا بھی قسم ہے
جزدان رکھے ہیں سب طاق پہ غفلت کے برابر
اب جرأت اخلاق بھی معدوم ہوئی ہے
دنیا تھی کبھی گرد شجاعت کے برابر
میدان ترقی میں ہیں ہر قوم سے پیچھے
ہر اک ہے قدم کو مصیبت کے برابر
ہم بھول گئے آہ وہ اسلام کی تعلیم
تھا جس سے جہاں عقلِ حیرت کے برابر
میں بانیِ اسلام سے فریاد کروں گا
سمجھا کرے کچھ جو شکایت کے برابر
میں پڑھ کے سناؤں گا یہی نظم جگر سوز
قسمت سے جو پہنچا درِ دولت کے برابر
جان آئے گی ایک مرتبہ پھر مردہ دلوں میں
پھر برسیں گے ابر آپ کی رحمت کے برابر
خالی کبھی جانے کا نہیں مجرم کا نالہ
رکھتا ہے اثر صورِ قیامت کے برابر

(32)

میزبان و میہمان

عید اضحیٰ سچ بتا وہ بھی زمانا یاد ہے
تجھ کو اپنا کچھ برس پہلے کا آنا یاد ہے

گرم نالے اور تھے جب سرد آہیں اور تھیں
جب ہمارے اور ہی دل تھے نگاہیں اور تھیں

آج کل کی طرح کب خونِ جگر پیتے تھے ہم
ذکر یہ اُس وقت کا کرتے ہیں جب جیتے تھے ہم

جب ہماری قوم کا اک اک بشر انسان تھا
جب ہمارے جسم میں دل دل میں جب ایمان تھا

جب ہمارے خوشہ چیں اسپین و روم و چین تھے
ہم میں جب اسلام تھا اسلام کے آئین تھے

خاک کے پتلوں کو مٹی سے تکدر کچھ نہ تھا
جب امیروں کو غریبوں سے تنفر کچھ نہ تھا

راز سے واقف تھے تیرے جانتے تھے جب تجھے
اپنے آپے میں تھے ہم پہچانتے تھے جب تجھے

جب سمجھ رکھا تھا ہم نے تیرا منشا اتفاق
اب پرایا ہوگیا جب تک تھا اپنا اتفاق

یہ نمائشِ ظاہری جھوٹی یہ زیبائش نہ تھی
سادگی کو حاجتِ تزئین و آرائش نہ تھی

محسنِ خلقت تھے ہم منت کشِ خلقت نہ تھے
موجبِ حیرت تھے جب آئینۂ حیرت نہ تھے

لاکھ تکلیفیں تھیں پر تکلیف روحانی نہ تھی
فکر تھی انجام کی فکرِ تن آسانی نہ تھی

کیا کہیں اپنی کہانی تجھ سے شرمندہ ہیں ہم
مر چکے جو موت سے پہلے ہی وہ زندہ ہیں ہم

ہے کہاں وہ کشتۂ جذباتِ حسرت پوچھ لے
تجھ کو معلوم ہے ساری حقیقت پوچھ لے

کر سکے جو اب تری دعوت کا ساماں کون ہے
نام کے لاکھوں مسلماں ہیں مسلماں کون ہے

(33)

پراگ راگ

یاد ہے مجھ کو الٰہ آباد وہ لطفِ چمن
تیری خسرو باغ میں تھی گرم اپنی انجمن
میں نہ بھولوں گا کبھی کیفیتِ گنگ و جمن
واں بھی لے پہنچا مذاقِ شعر یا دیوانہ پن
آئے ہوں گے اہلِ دنیا اس طرح کم دیکھنے
ہم گئے تھے جس نظر سے ترا سنگم دیکھنے

وہ تو دریا تیرے پہلو میں ہیں وہ دریائے نور
ہیں یہ وہ معشوق از حد وہ حسیں ہیں پُر غرور
وہ شرابی مست ہیں کھوئے ہوئے عقل و شعور
سچ اگر پوچھو تو وہ مصراع موزوں ہیں ضرور
تیرا دریا نہیں یہ ہے اشارہ صاد کا
تیرا سنگم ہے کہ مطلع ہے کسی اُستاد کا

وہ کسی کافر کے گیسو ہیں یہ بل کھاتے ہوئے
وہ یہ کالے ناگ ہیں پانی کے لہراتے ہوئے
ہیں یہ وہ پیغامبر آتے ہوئے جاتے ہوئے
وہ کوئی ساغر بکف ساقی ہیں اٹھلاتے ہوئے
وہ نمازی منہمک ہیں سجدۂ معبود میں
وہ مسافر ہیں تلاشِ منزلِ مقصود میں

چھین لیں دل دیکھنے والے کا وہ اٹکھیلیاں
جیسے آپس میں گلے ملتے ہیں دو سہیلیاں
موج میں اپنی بسر کرتی ہیں یہ البیلیاں
سب کو دیتی ہیں سبق، ہیں کس گرو کی چیلیاں
میل ان دونوں کا ہے گویا اک اخلاقی جہاد
ایک تصویرِ محبت اک مثالِ اتحاد

دفترِ کونین کا زرّیں سے بھی زرّیں ورق
مکتبِ اخلاق کا بہتر سے بھی بہتر سبق
وہ خزانہ جس خزانہ کا زمانہ مستحق
گبرو ترسا، کافر و مومن کا یکساں، جس میں حق
دستِ فیاضِ کریم و کاوشِ جانِ بخیل
سیکڑوں قوموں کی خاطر ایک پانی کی سبیل

قابلِ تحسین ہے تیری نگاہِ انتخاب ہیں دریا ہند میں دونوں یہ دریا لاجواب
صبحِ جنت اس کو کہیے اور اُسے موجِ شباب سرخی سے اور بھی کچھ بڑھ گئی ہے آب و تاب

تیری تر بینی پہ کیونکر ہو نہ عالم نور کا
اس میں دو پر ہیں پری کے، ایک آنچل حور کا

کون آکر دیکھتا ہے دوپہر کا یہ سماں کیا ستم کرتا ہے مل کر دھوپ سے آبِ رواں
چادرِ آبی پہ کرنوں کی غضب زردوزیاں بلبلے ہیں یا کہ رقصاں ہیں سنہری پتلیاں

کون جانے لطف کیا ساحل کے سناٹے میں ہے
جس نے یہ منظر نہیں دیکھا وہی گھاٹے میں ہے

تجھ کو بھی معلوم ہے ساحل پہ تیرے اے پراگ حسنِ عالم سوز نے کیسی لگا رکھی ہے آگ
آگ پانی ایک جا ہے دیکھ لے قدرت کی لاگ تو تو کچھ بیہوش سا ہے میں سناؤں کس کو راگ

تیری مدہوشی بجا ہے تو رہے کیا ہوش میں
آنکھ جب کھولی نظر آئے حسیں آغوش میں

چشمِ جادو دیکھ کر وحشی سراپا بن گیا خالِ ہندو دیکھ کر چشمِ تمنا بن گیا
اُلجھے گیسو دیکھ کر بگڑا سا نقشا بن گیا مجمع جب محوِ تماشا سے تماشا بن گیا

دی صدا دل نے یہ فطرت کی تماشا گاہ ہے
چشمِ بینا نے کہا اللہ ہی اللہ ہے

(34)

کسان

ہے حیاتِ نوعِ انسانی تری ہستی کا راز   کچھ خبر بھی ہے تجھے او بھولے بھالے بے زباں
تجھ سے بہتر کس نے کیں خلقِ خدا کی خدمتیں   تجھ سے بڑھ کر سیر چشمی کی دکھائی کس نے شاں
ہے ترا مرہونِ منت بادشہ ہو یا گدا   ہے ترا ممنونِ احساں پیر ہو یا نوجواں
تجھ کو خالق نے دیا ہے رتبۂ ابرِ کرم   ہے ترے خوانِ کرم پر دوست دشمن میہماں
تو ہے با اخلاص خادم ایک مُلک و قوم کا   بے ریا اک دوست ہے تو بے غرض اک مہرباں
تیرے نغمے ہیں فقط دلسوز تیرے کھیت پر   یہ بھلا دیتے ہیں سب دن بھر کی محنت کی تکان
دل میں رکھ لیجے تری اس وقت کی سچی خوشی   جب پلاتا ہے زمیں کو تیری پانی آسماں
قابلِ صد رشک ہے یہ سیدھی سچی زندگی   سادگی پر تیری صدقے شہریوں کی آن بان
تیرا طرزِ زندگانی ہے تصنع سے بری   تیری باتوں میں نہیں مطلق بناوٹ کا نشاں
دیکھنے والوں کی آنکھیں ہوں حقیقت میں اگر   ہیں کہیں محلوں سے بالاتر ترے کچے مکاں
تو نہیں واقف کہ کہتے ہیں کسے مکر و فریب   تجھ پہ ہوتا ہے مجھے اکثر فرشتے کا گماں
تجھ کو اُلفت ہے مویشی سے بھی بچوں کی طرح   دہر میں قائم ہے تیری ذات سے امن و اماں
قابلِ تقلید ہے یہ تیرا ایثارِ غریب   تو نے دنیا میں دیا ہے سب سے اچھا امتحاں
تجھ کو اکثر کھاتی ہیں تیری جانکاہیاں   کون ہے ان تری اَن تھک کوششوں کا قدرداں

اپنی محنت کے ثمر وقفِ تمنائے جہاں
مرحبا اے مردِ میداں صاحبِ ہمت کساں

(35)

دارالادب اکبرآباد

ے دیار آگرہ اے ہند کے دارالادب — بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و منتخب
ن شاو جہاں اُردو کی خلقت کا سبب — تجھ سے ملتا ہے جہاں میں نسل اُردو کا نسب

کیوں نہ ہو آفاق میں پھر تیری ہستی لاجواب
چھانٹ لے جب تجھ کو اکبر کی نگاہِ انتخاب

س زبانوں پر تری رونق کے افسانے بہت — شمع زد تھے سینکڑوں تجھ میں تو پروانے بہت
س ڈھلے جو بن پہ بھی نکلیں گے دیوانے بہت — بن گئے ہیں تیرے مٹانے سے مٹانے بہت

خوبیاں سب مٹ چکیں بس نام باقی رہ گیا
بانٹ کر سب جام خالی ہاتھ ساقی رہ گیا

تھے نظیر و جرأتؔ و مضمونؔ کیا کیا من چلے — کس سے پنہاں ہیں دکھائے جو بجانے ولولے
ہمارے میرؔ و غالبؔ حیری گودی کے پلے — لکھنؤ دلّی کے جن کے نام سے سکے چلے

جانِ جاناں حضرت مظہرؔ تھے جانِ آرزو
شاعروں کے قبلۂ و کعبہ تھے خانِ آرزو

ورِ اوّل میں کوئی مضمون سے بہتر نہ تھا — آرزو سے دورِ ثانی میں کوئی بڑھ کر نہ تھا
میرؔ کا دورِ سوم میں ایک بھی ہم سر نہ تھا — دورِ چارم میں کسی کو فوق جرأتؔ پر نہ تھا

درحقیقت رشکِ عرفیؔ فخرِ طالبؔ ہوگیا
دورِ پنجم میں تو غالبؔ کل پہ غالبؔ ہوگیا

سب پہ ظاہر ہے فصیحؔ ذی شرف کا علم و فن — تھا نصیحؔ و قیصرؔ و آغاؔ سے کیا لطفِ سخن
تھی رہا کی ذات گویا ایک شمعِ انجمن — بھول سکتا ہے رئیسؔ خوش بیاں کا بانکپن

کیوں نہ ہوتا تجھ پہ صدقے ہر گھڑی ہر بار چاند
فیضِ مہرؔ و ماہ سے تجھ کو لگے تھے چار چاند

اب زباندانی کا دعویٰ کر رہا ہے اک جہاں
بن رہے ہیں مردمِ پنجاب تک اہلِ زباں
تیری خاموشی میں پوشیدہ ہے کیا رازِ نہاں
دل ہی میں گھٹ گھٹ کے کیوں رہتا ہے آہوں کا دھواں

منظرِ عبرت یہ ظلمِ چرخِ نیلی پوش ہے
بولنا جس نے سکھایا سب کو وہ خاموش ہے

کیوں تجھے چپ لگ گئی ہے او مرے نازآفریں
بلبلیں اب بھی ترے رنگیں چمن میں کم نہیں
ہنس رہی ہے تجھ پہ دنیا کھول چشمِ شرمگیں
پھر بتا دے سرزمیں کو اپنی چرخِ چار میں

آگ دنیا میں لگا دیں وہ شرارے اب بھی ہیں
چاند سورج تھے اگر پہلے ستارے اب بھی ہیں

ہے امانت آج تک قلبوں میں وہ سوز و گداز
ہے وہی اگلا سا حسن و عشق میں راز و نیاز
پھر قیامت ہے یہ خاموشی تری او محوِ ناز
بتکدہ کیوں بن گئی محفل تری محفل طراز

بادہ کش لاکھوں ہیں ذوقِ بادہ پیمائی نہیں
اتنے دیوانے ہیں اور ہنگامہ آرائی نہیں

مٹ گیا کیوں نام تیرا تیری شہرت کیا ہوئی
تیرے فرزندوں کی تجھ سے وہ محبت کیا ہوئی
تجھ سے ہے نقادؔ شاکی تیری غیرت کیا ہوئی
اک قیامت ہو گئی کمبخت غفلت کیا ہوئی

ایک بلبل نالہ کش ہے جو چمن سے دور ہے
تجھ کو سودا ہے کچھ کچھ وہ وطن سے دور ہے

(36)

وصفِ واصف

دنیا ہے رنج و غم کی منزل　زخمِ تازہ ہے روز حاصل
صَرفِ فریاد کیوں نہ ہو دل　اُٹھا اک اور مردِ کامل
ہر قلب پہ غم کا بار ڈالا
واصفؔ نے مر کے مار ڈالا

وہ شعر کی جان سخن کی زینت　ہر بزم ہر انجمن کی زینت
وہ گل جس سے چمن کی زینت　وہ دُر جس سے عدن کی زینت
کیا کیا نہیں سب نے خاک چھانی
مٹی میں ملا کے موت مانی

ہر قلب میں تھا وقار اُس کا　ہر دل میں تھا اعتبار اُس کا
سب سے جھکنا شعار اُس کا　رحمت کا ہو گھر مزار اُس کا
ایسا کوئی صلح جو نہ ہوگا
ہوگا پہ فرشتہ خو نہ ہوگا

حالی سب پہ ہے حالِ واصفؔ　جائے کیوں کر خیالِ واصفؔ
اس طرح نہ ہو ملالِ واصفؔ　اللہ اللہ کمالِ واصفؔ
جتنا اُسے ضعف نے گرایا
اُتنا ہی قلم میں زور آیا

اُس کی وہ زندگی تھی سادی　کیا وضع اخیر تک نبھادی
تنِ سادہ روی دکھادی　خاموشی میں بات یہ بتادی
سر میں نہ کبھی غرور رکھنا
ہر وقت خودی کو دور رکھنا

تھا شعر و سخن کا مردِ میداں — اُردو پہ کیئے ہیں اُس نے احساں
ابر کا بھی چاک ہے گریباں — ذاتِ واصف تھی ابرِ نیساں
اُردو کیوں کر نہ اُس کو روتی
کیسے کیسے لُٹائے موتی
تھا جو خبر فغاں کی صورت — دیکھی بس آسماں کی صورت
کیسا دردِ نہاں کی صورت — دل بیٹھ گیا مکاں کی صورت
اُٹھتے جاتے ہیں اُف مشاہیر
اے نجم یہ آگرہ کی تقدیر

(37)

صبح وشام

جھوٹے ہیں قول و قرارِ صبح و شام — زندگی اور اعتبارِ صبح و شام
قدرِ منعم کو غریبوں کی ہے کہاں — ہے وہ معروف شمارِ صبح و شام
دشتِ غربت میں ہوئی قدرِ وطن — اور کچھ تھی واں بہارِ صبح و شام
ہر گھڑی ہے خوف پیغامِ اجل — خاک کیجے اعتبارِ صبح و شام
اب بھی دل دنیا سے اُکتایا نہیں — کر تو او غافل شمارِ صبح و شام
ہیں سبق آموز یہ نیرنگیاں — دیکھ او محوِ بہارِ صبح وشام
چل بسا بیمار او پیماں شکن — کرتے کرتے انتظارِ صبح و شام
دل جلے تا کام نکلے کام کے — مہر و مہ پر ہے مدارِ صبح و شام
جوشِ وحشت میں نکل جاؤں کدھر
نجم گھیرے ہے حصارِ صبح و شام

(38)

بچہ کی دعا

چھوٹا سا ہوں میں بچہ بیٹھا ہوں سر جھکائے — تیرے حضور میں ہوں ننھے سے ہاتھ اٹھائے
کیا چیز تجھ سے مانگوں بھولا ہوا ہوں بالکل — اماں نے کچھ دعا کے الفاظ تھے سکھائے
کل ہی بتا رہی تھیں مجھ کو یہ میری آپا — یہ چاند اور ستارے سب تو نے ہیں بنائے
بھائی کا تھا یہ کہنا جگ میں بڑا وہی ہے — جس کو ترے کرم کا تحفہ بڑا بنائے
ابا یہ کہہ رہے تھے جب میں تجھے پکاروں — ممکن نہیں کہ تیری رحمت نہ مسکرائے

(39)

آج کا حیدرآباد

دیدنی ہے اے نگاہِ روزگار — عہدِ آصف جاہ سابع کی بہار
روح پرور حیدرآباد آج ہے — زندگی کی عافیت کا راج ہے
پختہ سڑکوں پہ صفائی روشنی — جس سے نظارہ میں آئی روشنی
کیا چمن سر سبز ہیں گلپوش ہیں — کتنے ساگر ہیں جو دریا نوش ہیں
ہر طرف سامانِ آرائش بھی ہے — علم کی حکمت کی افزائش بھی ہے
وہ کتب خانہ کا منظر لا جواب — جس کا دروازہ ہے ہمشکلِ کتاب
مدرسے . تحتانیہ فوقانیہ — سب پہ بالا جامعہ عثمانیہ
غیر ہو کس طرح بیماروں کا حال — گود . پھیلائے ہوئے ہیں اسپتال
بات کیوں انصاف کی ہو دل پہ بار — کیا عدالت عالیہ ہے شان دار
ملک میں ہے صنعت و حرفت کا دور — اب گیا مزدور کی عسرت کا دور
دھوم پیپر مل شکر مل کی بھی ہے — باعثِ تفریح لاٹکی بھی ہے

(40)

باغ عام

خاص چیزوں میں ہے اس کا نام بھی
سیر کے قابل ہے باغ عام بھی

کچھ نئی اور کچھ پرانی شان ہے
میوزیم کا اِک طرف سامان ہے

جا بجا ہیں کچھ عمارات بلند
وضع ہے جن کی نہایت دل پسند

گھاس پر رکھی ہیں کچھ توپیں قدیم
جن کے ڈر سے دل ہوئے ہوں گے دونیم

اب کسی کو ان سے کاوش کچھ نہیں
آج مقصد جز نمائش کچھ نہیں

ایک دلچسپی کا یہ منظر بھی ہے
یہ چمن بھی اور چڑیا گھر بھی ہے

جانور ہر رنگ کے گلشن میں ہیں
بند اپنے آہنی مسکن میں ہیں

اک تماشا ہیں زمانے کے لیے
عام نظروں کو لبھانے کے لیے

کررہا ہے اور اسے مقبول عام
ایک سالانہ نمائش کا قیام

صنعت وحرفت کا سالانہ ورود
حُسنِ صورت کی بڑھاتا ہے نمود

زینتوں سے گرچہ مالا مال تھا
مدتوں سے اس میں ناؤن ہال تھا

بڑھ گئی شان اور تجلی ہال سے
جشنِ سیمیں کے مبارک سال سے

(41)

آرائشِ بلدہ

کیا خوب ہے آرائشِ بلدہ کا ادارہ
فردوسِ نظر بن گیا بلدہ کا نظارہ

ہر سمت ہیں خوش وضع مکانوں کی قطاریں
گلیوں میں ترقی کے نشانوں کی قطاریں

نظروں کی مدارات کا پابند ہے منظر
صورت میں ہیں یکساں تو خوش آیند ہے منظر

صحت کو مضر جو ہو وہ سامان نہیں ہے
فصل ایک سے ہے ایک کا گنجان نہیں ہے

تعریف کے قابل ہے یہ تجویز و عمل بھی
اکثر میں تو بجلی بھی ہے پانی کا ہے نل بھی

کیوں کر نہ زباں پر ہو غریبوں کی ستائش
آرام کا آرام نمائش کی نمائش

ہیں گرچہ ہزاروں ابھی درکار ہیں لاکھوں
خالی نہیں رہتے کہ خریدار ہیں لاکھوں

(42)

مُوٹر بس

یہ دورِ حاضرہ کا فیض جاری
یہ این۔ایس۔آر موٹر بس ہماری

چمکتی صاف ستھری وہ نشستیں
غریبوں کی امیرانہ سواری

ہنر مندوں کی صنعت کا کرشمہ
سبک اتنی اور ایسا جسم بھاری

نہ شور و غل نہ تیزی ریل کی سی
رواں ہے صورتِ بادِ بہاری

دھندلکے سے سحر کے نصف شب تک
وہ انجن کی مسلسل بے قراری

کرایہ نسبتہً کم منزلیں دور
سراسر بے بسوں کی پاسداری

ہم ایسے نوجواں منصب ہے جن کا
وطن اور ملک کی خدمت گذاری

بچاتے ہیں ہم اپنا قیمتی وقت
نہیں پیدل سفر کرنے سے عاری

(43)

جنگی نمائش

بڑی دلچسپ ہے جنگی نمائش یہ سن چھپّن کی یک رنگی نمائش
پیامِ زندگی تازہ ہے جس کا نمودِ فتح دروازہ ہے جس کا
وہ دروازہ نہ کیوں منھ سے بولے جسے دستِ شہ ذی جاہ کھولے
بماوِ ریڈیو تقریرِ شاہی وہ گردوں پہ مزاجِ نشر گاہی
نمائش میں حقیقت کا طریقہ سکھاتے ہیں لڑائی کا سلیقہ
یہ منظر ہے ثبوتِ زندگانی یہاں انگڑائی لیتی ہے جوانی
رعایا کے لیے حفظ و حمایت سپاہی کے لیے درسِ شجاعت
رگوں میں خوں یہاں لیتا ہے لہریں ابلتی ہیں یہاں جذبوں کی نہریں
جلوسِ اِک آئینہ دارِ نمائش گذر گاہوں پہ اسرارِ نمائش
وہ آئینِ وفا کی پاس داری سلامی اور جوابِ شہریاری
نئی انگریز خاتونوں کی پلٹن وطن کا درد ہر چہرہ سے روشن
قیامت خیز وہ جنگی مشینیں کہ لرزاں جن کے قدموں میں زمینیں
وہ ہیبت ناک پڑولی قرابے فلک کو دابنے والے دبابے
وہ حیرت خیز ہمت آزمائی نشاط انگیز مصنوعی لڑائی
وہ طیاروں کی تیاری کا عالم وہ بم باروں کی بمباری کا عالم
مکاں جلتے ہوئے برباد کھیتی نئی دنیا کی لاشیں سانس لیتی

انھیں باتوں سے پائندہ ہیں قومیں
انھیں سے آج کل زندہ ہیں قومیں

(44)

گولکنڈہ

گولکنڈہ نازشِ مُلکِ دکن ‏ — شاہ کا مسکن سپاہی کا وطن
قلعہ تھا اُس وقت بھی پر خام تھا ‏ — عہدِ راجائی میں منگل نام تھا
اُس کی یہ رفعت پسندی دیکھنا ‏ — چار سو فٹ کی بلندی دیکھنا
طول میں ہے چار میل اس کا حصار ‏ — آٹھ دروازے بلند اور شان دار
پائداری میں جواب آہن کا ہے ‏ — بعض پتھر جس کا اِک اِک ٹن کا ہے
چار جانب بُرج ستاسی عدد ‏ — جن سے وقتِ جنگ ملتی تھی مدد
مسجدِ جامع سے شان اسلام کی ‏ — ایک ہیبت ہے خدا کے نام کی
یہ روا داری کا منظر دیکھئے ‏ — جاکے مادنّا کا مندر دیکھئے
ان کی یکجائی بڑی پہچان ہے ‏ — جس جگہ ہو اتحادی شان ہے
کیسے کیسے مالکِ تاج و سریر ‏ — سو رہے ہیں خاک پر مثلِ فقیر
گنبدوں میں کجکلاہی دفن ہے ‏ — خاندانِ قطب شاہی دفن ہے
چھپ گئے ہیں جس میں یہ نام و نگیں ‏ — لعل اُگلتی تھی کبھی یہ سرزمیں
جو ہر اک الماس سے بالا ہوا ‏ — ہے اسی آغوش کا پالا ہوا

نور سے تقدیر نے معمور کی
سر زمیں یہ ماں ہے کوہِ نور کی

(45)

چار مینار

نظر یہ دور سے آتا ہے کس کا قامتِ بالا
کھڑا ہے کون پُچھکا چار جانب دیکھنے والا

فنِ تعمیر کے خوش وضع خوش منظر نشانوں میں
نگاہوں کا نشانہ کس کی ہستی ہے کمانوں میں

بہرصورت کسی معمورۂ مسعود کی صورت
شبیہِ تعزیہ یا مسجدِ معبود کی صورت

گذشتہ دور کا آئینہ بردار اس کو کہتے ہیں
بنا جب سے پڑی ہے چار مینار اس کو کہتے ہیں

یہ مسکن صنعتوں کا خوبیوں کا آشیانہ ہے
کہ اک اک نقش عہدِ قطب شاہی کا فسانہ ہے

یہ بلدہ میں ہے بالا ہر طرح بلدہ کی بستی سے
ہوئی ہے شہر کی بنیاد قائم اس کی ہستی سے

عمارت ایک ہے دو منزلیں مینار چار اس کے
سڑک ہے ہر طرف پہلو میں چاروں پُر بہار اس کے

یہاں اک مدرسہ بھی تھا کبھی دارالاقامہ بھی
درخشاں آج تک ہے ملک میں یہ کارنامہ بھی

یہاں تھا علم کا چشمہ تو پانی کا خزانہ تھا
کبھی سیراب اس کے فیض سے سارا زمانہ تھا

نئی دنیا سے اور اک حُسن پایا حُسنِ ظاہر نے
لگا دیں چار جانب چار گھڑیاں دورِ حاضر نے

ابھی باقی ہے آثارِ سلف کی گرم بازاری
ابھی چلتا ہے سکہ مملکت میں چار میناری

(46)

ہندوستان

کیسے ہیں اچھے اچھے کیسے ہیں پیارے پیارے
ہندوستاں کے جگنو ہندوستاں کے تارے
ہندوستاں کی نہریں ہیں میرے دل کی لہریں
نہروں میں ہے ترنم لہروں میں ہیں شرارے
سرسبز جھاڑیاں ہیں اونچی پہاڑیاں ہیں
خاموش آسماں سے کرتی ہوئی اشارے
کلیاں بکس رہی ہیں پھولوں سے ہنس رہی ہیں
خوشبو کے بہہ رہے ہیں سارے چمن میں دھارے
کیسے حسیں پرندے کیا مہ جبیں پرندے
عنقا بھی جن کے آگے حیرت سے پر نہ مارے
گرمی میں خوب گرمی، سردی میں خوب سردی
ہارا نہ ہم سے موسم، موسم سے ہم نہ ہارے
سب ہند پہ ہیں نازاں ہندو ہو یا مسلماں
یہ مادرِ وطن کے دونوں ہیں ماہ پارے
جنسِ وفا ہے سستی مسلک ہے حق پرستی
ایسے وطن پہ کوئی کیوں جان و دل نہ وارے

(47)

کسان کی فریاد

شہر کے رہنے سہنے والو
گاؤں کو جنگل کہنے والو
یہ ہے اک نرالی بستی
مایا مہنگی جیتا سستی
چوڑی چکلی دھرتی دیکھو
کھلی ہوا کی بھرتی دیکھو
کیسا ٹھنڈا میٹھا پانی
ستھرا صاف کنوئیں کا پانی
چار طرف سے بستی روشن
پورب پچھم اتر دکھن
سارے کھیت ہرے ہریالے
تال تلیاں ندی نالے
پیڑ گھنیرے ٹھنڈے سائے
گھر کر جیسے بادل آئے
پھر بھی من کو چین نہیں ہے
چین کبھی دن رین نہیں ہے
بھید یہ کیا ہے صاف بتادوں
دنیا کا انصاف بتادوں
کھیتی کا ہے کام انوکھا
کام کا ہے انعام انوکھا
محنت کا یہ پھل ہے نیارا
بھوسہ میرا ناج تمھارا

(48)

مزدور کی آواز

مجھ سے نفرت کیوں ہے تجھ میں اگر مزدور ہوں — کیا تمھیں یہ وہم ہے انسانیت سے دور ہوں
ہے فقط سامانِ آسائش اگر انسانیت — میرے ہاتھوں سے بنی ہے بیشتر انسانیت
میرے ہی دم سے ہے جو کچھ ہے تمھارے آس پاس — یہ مکاں، یہ باغ، یہ بستر، یہ برتن، یہ لباس
میں نے لوہے کو گلایا میں نے توڑے ہیں پہاڑ — میں نے گلشن کر دیا، ورنہ یہ دنیا تھی اُجاڑ
علم سیکھا جس سے تم نے ان کتابوں کی قسم — میری ہمت نے بنایا ہے یہ کاغذ یہ قلم
ہے یہ بنیادِ ترقی میری ہی ڈالی ہوئی — ریل کی پٹری ہے میرے ہاتھ کی ڈھالی ہوئی
کوئی صنعت ہو مری محنت کا شامل ہے گداز — میری ہی طاقت نے پانی پر چلائے ہیں جہاز
میرا کس بل ہے جو بجلی سے بھرے تاروں میں ہے — سب یہ میرے بازوؤں کا زور طیاروں میں ہے
میں نے وہ ڈھانچہ بنایا جس میں یہ آواز ہے — ریڈیو نغمہ تمھارا ہے تو میرا ساز ہے
میری ہستی ہے تمھارے عیش و راحت کی مشین — سب مشینیں مجھ سے ہیں، میں ہوں وہ قدرت کی مشین
میرے جلوے سے ہیں روشن علم و حکمت کے چراغ — میری محنت گر نہ ہو بیکار ہیں سارے دماغ

(49)

سب ایک

ہندو مسلم سکھ عیسائی — ہند میں سب ہیں بھائی بھائی
ایک ہی گودی بیٹھے لیٹے — ایک ہی ماں کے سب ہیں بیٹے
ملک پہ سب جی دینے والے — ایک ہی کشتی کھینے والے
پوت سپوت دھنی مزدورے — بھارت کے ہیں سیوک پورے
ہم بھی سارے وہ بھی سارے — سب ہیں ماں کی آنکھ کے تارے

(50)

ہندوستان کا معصوم بچہ

مجھے ہر رنگ میں حاصل محبت کی ہے شادابی
میں دکھن میں ہوں مدراسی تو اتر میں ہوں پنجابی
میں جو کچھ بھی ہوں جس عالم میں ہوں ہندوستانی ہوں
میں بنگالہ کے قصے میں ہوں یوپی کی کہانی میں
وہی اک جسم ہے کرتے میں ہو یا شیروانی میں
میں جو کچھ بھی ہوں جس عالم میں ہوں ہندوستانی ہوں
میں سب کو مسکرا کر پیار کی نظروں سے تکتا ہوں
کوئی ہندو یا مسلم ہو میں سب پہ ہمکتا ہوں
میں جو کچھ بھی ہوں جس عالم میں ہوں ہندوستانی ہوں
مجھے دلّی کا قلعہ آگرہ کا تاج بھاتا ہے
ایلورا جی کو لگتا ہے اجنتا دل لبھاتا ہے
میں جو کچھ بھی ہوں جس عالم میں ہوں ہندوستانی ہوں
توجہ ہے بہر صورت قریب و دور پہ میری
نظر الحق ہے یکساں منعم و مزدور پہ میری
میں جو کچھ بھی ہوں جس عالم میں ہوں ہندوستانی ہوں
وہی نر ہے اگر لکڑی کے گٹھے کی مصیبت ہو
وہی دل ہے بغل میں گر قلمدانِ وزارت ہو
میں جو کچھ بھی ہوں جس عالم میں ہوں ہندوستانی ہوں
نہ آوازِ اذاں تکلیف کا پیغام لاتی ہے

نہ گھنٹہ کی صدا سے میرے دل پر چوٹ آتی ہے
میں جو کچھ بھی ہوں جس عالم میں ہوں ہندوستانی ہوں
میں اک اک ہند کے ذرے کو اپنی جان کہتا ہوں
میں ہر صوبہ سے ہندوستان ہندوستان کہتا ہوں
میں جو کچھ بھی ہوں جس عالم میں ہوں ہندوستانی ہوں
کھڑا ہوں گا جب اپنے پاؤں پر تب رنگ لاؤں گا
یہی پیغام لاؤں گا یہی آہنگ لاؤں گا
میں جو کچھ بھی ہوں جس عالم میں ہوں ہندوستانی ہوں

(51)

لڑکا

ترن میں سن لو میرا گڑکا | میں ہوں ہندوستانی لڑکا
سورج کا میں نورِ نظر ہوں | مشرق کا میں لختِ جگر ہوں
چاند ہے میرا ایک کھلونا | میرے وطن کی دھوپ ہے سونا
ٹھنڈی ٹھنڈی نہریں میری | گرم ہوا کی لہریں میری
کھیت میں پنچھی کایا میری | دھرتی مایا میری
پربت پربت چڑھنے والا | آندھی ایسا بڑھنے والا
ہند کا روشن تارا ہوں میں | دیس کو اپنے پیارا ہوں میں
دونوں ہیں شیدائی میرے | ہندو مسلم بھائی میرے
جگ ہے جب انگڑائی لیتی | آتا ہوں میں چھوڑ کے کھیتی
بجلی بادل کوئی نہ ٹوکے | میرا رستہ کوئی نہ روکے
ڈر کی پروا کرتا کب ہوں | ہندی ہوں میں ڈرتا کب ہوں

(52)

ہندوستان کی لڑکی

حیا کا دل وفا کی جان ہندستان کی لڑکی
وہ سر سے پاؤں تک انسان ہندستان کی لڑکی
وہ شوہر کی پجارن باپ ماں کی چاہنے والی
وہ ہندستان کی پہچان ہندستان کی لڑکی
وہ تن من دھن سے اپنے دیس کی خدمت پہ آمادہ
وہ ہندستان پہ قربان ہندستان کی لڑکی
کبھی جھانسی کی رانی چاند سلطانہ کبھی بن کر
بہت دیکھے ہوئے میدان ہندستان کی لڑکی
شرافت کے طریقے میں محبت کے سلیقے میں
مجسم خود وہ ہندستان ہندستان کی لڑکی

(53)

آغوشِ مادر

ننھے سے پیارے بچے آئے ہو تم کہاں سے
لائی ہے مجھ کو فطرت خوابوں کے آشیاں سے
بھونرا سی کالی آنکھیں پائی ہیں کس چمن سے
آیا ہوں یاں گزر کر میں رات کے وطن سے
آنکھوں میں یہ چمک یہ نرمی کہاں سے آئی
مجھ سے نظر ملا کر اک حور مسکرائی
ننھی سی اس جبیں میں یہ شانِ ہوش مندی
مجھ کو لیے ہوئے تھی آغوش میں بلندی
موتی سے کان کیسے پائے ہیں میرے پیارے
کرتے تھے مجھ سے باتیں وہ عرش کے ستارے
پیارے لبوں نے سیکھی کس سے یہ مسکراہٹ
غنچہ یہ کھل گیا ہے بوسہ کی پا کے آہٹ
یہ اشکِ غم ہیں کیسے اس روئے نازنیں پہ
یہ میرے منتظر تھے پہنچا ہوں جب زمیں پہ

(54)

لوری

سو جا! سو جا! میرے چاند　　چاند ہو تیرے آگے ماند
سو جا! سو جا! میرے چاند!
سو جا! سو جا! میرے لال　　تیرا روز بڑھے اقبال
سو جا! سو جا! میرے چاند!
سو جا! سو جا! دل کے چین　　پیارے پیارے تیرے نین
سو جا! سو جا! میرے چاند!
سو جا! سو جا! اے دلدار　　تیرے قبضہ میں تلوار
سو جا! سو جا! میرے چاند!
سو جا! سو جا! میری جان　　تیرے ہاتھ رہے میدان
سو جا! سو جا! میرے چاند!

(55)

سہیلی

خدا نے دی ہے مجھ کو اک سہیلی　　جو اپنی خوبیوں میں ہے اکیلی
وہ مفلس باپ ماں کی نیک بیٹی　　ہزاروں بیٹیوں میں ایک بیٹی
قمر اس کے مقابل ماند سا ہے　　غریبی میں بھی چہرہ چاند سا ہے
نہ زیور ہے نہ ہے پوشاک بھاری　　میسر ہے فقط کھدر کی ساری
نہ ریشم کی نہ گوٹے کی لگن ہے　　وہ اپنے پڑھنے لکھنے میں مگن ہے
کتابوں سے سدا ہے میل اس کا　　پکانا ریندھنا ہے کھیل اس کا

وہ درزی کو کہاں گردانتی ہے   بہت سینا پرونا جانتی ہے
بہت علم و ہنر میں طاق ہے وہ   گرہستی میں بڑی مشتاق ہے وہ
ادا ہر ایک خوش ترکیب اس کی   سراپا مشرقی تہذیب اس کی
بڑوں کا ہے ادب چھوٹوں سے الفت   وطن کی خاک سے قلبی محبت
نمایاں ہر عمل سے وہ سلیقہ   جو تھا اگلے بزرگوں کا طریقہ
ہر اک ماں کو خدا دے ایسی بچی
وہ ہندستان کی بیٹی ہے بچی

(56)

کھیل کود

بچے کھلی ہوا میں چکر لگا رہے تھے   قومی کوئی ترانہ سب مل کے گا رہے تھے
گورے گلے سریلی شہنائیاں تھیں ان کی   فرشِ زمیں پہ رقصاں پرچھائیاں تھیں ان کی
تارے اُدھر فلک پر پھرتے تھے بھاگے بھاگے   سورج تھا پیچھے پیچھے اور چاند آگے آگے
عیش و طرب کا عالم یکساں تھا دو جہاں پر
جو کھیل تھا زمیں پر وہ کھیل آسماں پر

(57)

سوتی جاگتی گڑیا

میری گڑیا بڑی دلاری ہے
گوری گوری ہے پیاری پیاری ہے

میرے ابا نے لا کے دی ہے مجھے
عید کی صبح کو ملی ہے مجھے

ساتھ موٹر میں لے کے جاؤں گی
اپنا اسکول اسے دکھاؤں گی

اس کی جو بات ہے نرالی ہے
کس نے عادت یہ اس کی ڈالی ہے

نہ یہ سنتی ہے کچھ نہ کہتی ہے
اپنے کاغذ کے گھر میں رہتی ہے

نہ یہ چلتی ہے اور نہ پھرتی ہے
نہ مچلتی ہے اور نہ گرتی ہے

نہ یہ ہنستی ہے اور نہ روتی ہے
رات دن جاگتی ہے سوتی ہے

نہ یہ کھاتی ہے کچھ نہ پیتی ہے
کھانے پانی بغیر جیتی ہے

دوڑتی ہے نہ بھاگتی گڑیا
یہ مری سوتی جاگتی گڑیا

مجھ کو گڑیا یہ دل سے بھائی ہے
عید کے ساتھ ساتھ آئی ہے

(58)

کھلونوں کا اسپتال

چڑیوں میں تھا بہار کی آمد کا شور وغل
چاروں طرف ہے صبح سے اودھم مچی ہوئی
قائم ہوا ہے ٹوٹے کھلونوں کا اسپتال
چیزیں کچھ اسپتال میں دو تم بھی جانِ من
جو چیز دو گے تم وہ ذخیرہ بڑھائے گی
وہ دن بھی آئیں گے تمھیں دنیا کی سیر میں

گڑیوں کی سرزمیں پہ بھی ہے آج یومِ گل
گھر گھر ہے کھیل کود کی شادی رچی ہوئی
گڑیوں میں یادگار رہے گا یہ ماہ وسال
فیتہ ہو کوئی لیس ہو یا ہو کوئی بٹن
اک سوئی بھی ملے گی تو سو کام آئے گی
ہوگا تمھارا نام بڑا کارِ خیر میں

(59)

تتلی

خوشبو کی متوالی تتلی
رنگا رنگ کھلونا تو ہے
کلیوں کا دم بھرتے والی
ریشم جیسے پر ہیں تیرے
ہنستی کیوں ہے مڑتی کیوں ہے
سن لے مجھ سے راگ رسیلے
سب ہیں تیری دیکھی بھالی
پھولوں کی رکھوالن تو ہے
تو ہے راس چمن کو میرے

نیلی پیلی کالی تتلی
چاندی تو ہے سونا تو ہے
چم چم چم چم کرتے والی
دیکھوں کیسے پر ہیں تیرے
مجھ کو دیکھ کے اڑتی کیوں ہے
رس کی رسیا رس تو پی لے
پتی پتی ڈالی ڈالی
میرے باغ کی مالن تو ہے
مجھ سے آس وطن کو میرے

(60)

مکاں در مکاں

گرمیوں کی اک سہانی شام کو
گھر سے باہر ہم گئے تھے کام کو

ہم نے دیکھا راستہ میں ایک گھر
سبز ایسا جیسے ہو طوطے کا پر

غور سے دیکھا تو یہ منظر بھی تھا
سبز گھر میں ایک بھورا گھر بھی تھا

ہم نے بھورے گھر پہ جب ڈالی نظر
اس میں پیلے رنگ کا تھا ایک گھر

اس کے پاس اک اور گھر دیکھا سپید
جیسے ہو اک ململجا کپڑا سپید

یہ معمّا تم بتا سکتے نہیں
ان گھروں کا بھید پا سکتے نہیں

ہم ہی یہ پردے اٹھاتے ہیں جناب
راز ہر گھر کا بتاتے ہیں جناب

وہ ہرا گھر ایک ہے جھاڑی ہری
جس کی ہر اک شاخ ہر پتی ہری

گھر ہے بھورے رنگ کا اک آشیاں
زرد گھر ہے زرد چڑیا بیگماں

زرد چڑیا کے ہے قبضہ میں جو گھر
اس کا انڈا ہے وہ قصہ مختصر

(61)

رَین مسافر

رین مسافر جگ اجیالے
سب سے اونچے رہنے والے
چاندی سے بھی اجلا تو ہے
کس کا پیارا مکھڑا تو ہے
تجھ سے روشن رات اندھیری
گھر گھر میں ہیں کرنیں تیری
پربت سے سر اونچا تیرا
ہر گھر سے گھر اونچا تیرا
ہم سب پر ہے نیند کا ریلا
جاگ رہا ہے تو ہی اکیلا
اس گلشن کا مالی تو ہے
دنیا کا رکھوالی تو ہے
تیری شہرت دیکھ رہا ہوں
اپنی ہمت دیکھ رہا ہوں
چاند میں تجھ کو مانند کروں گا
اپنے وطن کا چاند بنوں گا

(62)

پَر دار موتی

مشرق میں صبح اک دن جب مسکرا رہی تھی
ننھی سی ایک لڑکی اسکول جا رہی تھی
چھوٹا سا رہگذر کے پہلو میں اک چمن تھا
کلیوں کا تھا ذخیرہ پھولوں کی انجمن تھا
خوشبو تھی بھینی بھینی منظر تھا پیارا پیارا
دم بھر کیا ٹھہر کر اس باغ کا نظارا
موتی بہت سے دیکھے پتوں کے دامنوں میں
کتنے چھپے ہوئے تھے پھولوں کی گودیوں میں
سوچی کہ واپسی میں لے جائیں گے اٹھا کے
پہنیں گے ہم گلے میں ہار ان کا اک بنا کے
پھرتا رہا نظر میں دن بھر جمال ان کا
آنکھیں کتاب پر تھیں دل میں خیال ان کا
پایا نہ ایک موتی واپس چمن میں آ کر
سورج کی گرم کرنیں سب لے گئیں اڑا کر

گھڑی

مجھے دیکھو بڑی صابر گھڑی ہوں
میں الماری میں برسوں سے پڑی ہوں
مری ٹک ٹک تمہارے کام کی ہے
میں خود سچی ہوں سچے بول میرے
سنو آواز میری منہ اندھیرے
مری ٹک ٹک تمہارے کام کی ہے
کہو محنت سے میں کب بھاگتی ہوں
میں رات اور دن ہمیشہ جاگتی ہوں
مری ٹک ٹک تمہارے کام کی ہے
کبھی تھکتی نہیں ہوں کام سے میں
غرض رکھتی نہیں آرام سے میں
مری ٹک ٹک تمہارے کام کی ہے
نہ گھبراؤ کبھی جھک جھک سے میری
سبق محنت کا لو ٹک ٹک سے میری
مری ٹک ٹک تمہارے کام کی ہے

(64)

ہوائی جہاز

ہمیں یاد ہیں کھیلنے کے جو ڈھنگ
ہوا میں اڑایا بنا کر پتنگ
ہوا اُس کی پہنچی جو اغیار تک
ہنر مند یورپ کے بازار تک
وہاں مل کے بیٹھے کچھ اہلِ دماغ
جلایا تفکر کا اپنے چراغ
کیا کام ذہنِ خدا داد نے
نئے پر نکالے اِس ایجاد نے
ترقی کا روشن ستارہ بنی
یہ ایجاد بڑھ کر غبارہ بنی
لیا اس سے وہ اہلِ مغرب نے کام
کہ لرزے میں ہے آج دنیا تمام
کھلا فکر کا اہلِ عالم پہ راز
بنا رفتہ رفتہ ہوائی جہاز
ہمارا کھلونا ہمارا پتنگ
ہوا آج سرتاجِ آلاتِ جنگ
بڑے کام ان کے بڑا نام ہے
یہ سب فکر و محنت کا انجام ہے
دماغوں سے اپنے جو ہم کام لیں
یونہی دستِ قدرت سے انعام لیں
رہیں پھر نہ دنیا کے تیور کڑے
ہماری بھی ہمت کا جھنڈا گڑے

(65)

سنیما گھر

نیا حکمت نے اک جلوہ دکھایا
سنیما ہند میں یورپ سے آیا
نئی شکلیں مشینوں نے سنواریں
کہ چلتی پھرتی تصویریں اُتاریں
اٹھے جب شوق کے دل میں شرارے
تماشا دیکھنے ہم بھی سدھارے
عمارت ایک دیکھی لمبی چوڑی
جہاں خلقت چلی آتی تھی دوڑی
وہ عورت مرد بوڑھے اور بالے
سبھی موجود تھے جیبیں سنبھالے
کھلی پیسوں کے بتیانے کی کھڑکی
ٹکٹ زردار کو مفلس کو جھڑکی
وہ باتوں کی صدا قدموں کی آہٹ
وہ برقی قمقموں کی جگمگاہٹ
نشستیں اونچی نیچی کرسیوں کی
عیاں چہروں سے بیتابی دلوں کی
یکایک ہال میں ہُوا گھپ اندھیرا
نہ چہرہ دیدنی میرا نہ تیرا
سیاہی میں نمایاں اک سپیدی
نگاہیں دیکھنے والوں کی قیدی
زمانے بھر کے پردے پہ نظارے
دماغوں اور مشینوں کے سہارے
مشینیں اہلِ یورپ کی کرامت
اِدھر لطفِ نظر ذوقِ سماعت

یہی ہے سلسلہ مدت سے جاری
دماغ ان کا ہے اور آنکھیں ہماری

(66)

عجیب صندوق

صندوق ہے ایک میرے گھر میں — مشہور ہے جو محلہ بھر میں
ظاہر میں ہیں طور اس کے ایسے — ابا کا ہو کیش بکس جیسے
پر سب سے جدا ہے رنگ اس کا — بالکل ہی نیا ہے ڈھنگ اس کا
ہنستا ہے کبھی کبھی ہے گاتا — مجھ کو ہے کہانیاں سناتا
ملکوں کے وہ بھید کھولتا ہے — انسان کی طرح بولتا ہے
جو بول ہیں صاف ہیں کھرے ہیں — کیا پیٹ میں اس کے گن بھرے ہیں
دیتا ہے اِدھر اُدھر کی خبریں — رکھتا ہے زمانہ بھر کی خبریں
سنتا ہے جو کوئی مانتا ہے — دنیا کی زبان جانتا ہے
کیسا ہے عجیب کام اس کا — جب جانیں بتادو نام اس کا

(67)

ڈاکیہ

وہ آتا ہے آتا ہے چٹھی رساں — وہ خط میرا لاتا ہے چٹھی رساں
گلے میں وہ تھیلا ہے ڈالے ہوئے — وہ کاندھے پہ جھولا سنبھالے ہوئے
کڑی دھوپ میں جلتا بھنتا ہوا — خطوں میں سے خط میرا چنتا ہوا
بھلی اس کی معلوم ہوتی ہے چال — بہت اس کی آمد سے دل ہے بحال
کبھی لا کے دیتا ہے آپا کا خط — کبھی میری اماں کا پاپا کا خط
کبھی چائے نوشی کی دعوت کا خط — کسی دن مرے دوست شوکت کا خط
یہ کیوں آتے آتے پھرا ڈاکیہ — یہ کیا کہہ رہا ہے برا ڈاکیہ
کہ خط آج کوئی تمھارا نہیں — مجھے اس کا آنا گوارا نہیں

(68)

نیا سال

ہوا سال کا آخری دن تمام   نئے سال کے پہلے دن کو سلام
نئے سال کی آئی پہلی سحر   میں پل میں بڑا ہوگیا سال بھر
سدھارا اندھیرا گئے سال کا   چمکتا ہے سورج نئے سال کا
بلندی پہ چمکی نئے دن کی دھوپ   دمکتی ہے جس طرح سونے کا روپ
میں آج اپنے ابا سے کیا مانگ لوں   خدا سے تو پہلے دعا مانگ لوں
مری عقل اللہ بڑھتی رہے   مرے علم کی دھوپ چڑھتی رہے
مرا ملک آباد و خوش حال ہو   مبارک نیا دن نیا سال ہو

ملے مجھ کو اے خالقِ آفتاب
نئے دن کا تحفہ اک اچھی کتاب

(69)

بڑے آدمی

بڑے آدمی تھے بڑے کام کے   جو ڈنکے بجا کر گئے نام کے
کوئی علم و حکمت میں نامی بنا   کوئی قوم کا اپنی حامی بنا
ریاضی میں تھا کوئی اہلِ کمال   کوئی فلسفہ میں ہوا بے مثال
تجارت سے کوئی ہوا نامور   سیاست میں کوئی بنا راہبر
مدد لے کے ذہنِ خدا داد کی   کسی نے نئی کوئی ایجاد کی
کسی سے ہے نام و نشانِ وطن   بنا کوئی جاں دے کے جانِ وطن

بہت ان میں مفلس تھے اکثر غریب
زمانہ سے تھا جن کا گھر بھر غریب

موافق یہ دنیا کا دھارا نہ تھا
کہیں جن کا کوئی سہارا نہ تھا

مگر دل بڑا تھا طبیعت بلند
ارادے بڑے اور ہمت بلند

وہ محنت کے زینے پہ چڑھتے رہے
وہ دنیا میں آگے ہی بڑھتے رہے

جہاں میں ہیں اب جن کے جھنڈے گڑے
وہ چھوٹے ہی سے تو ہوئے تھے بڑے

(70)

دعا

اے خدا اے دردمندوں کے خدا
عاجز و ناچیز بندوں کے خدا

اے زمانے بھر کے رکھوالے خدا
اے ہمارے پالنے والے خدا

تونے اے صورتِ گر انسانیت
ہم کو بخشا جوہر انسانیت

تیری قدرت آنکھ میں کاجل بنی
گود ماں کی مکتب اول بنی

ہم سے نادانوں کو دانا کردیا
فہم و دانش سے توانا کردیا

روشنی تیری دماغ و دل میں ہے
تو ہی رہبر علم کی منزل میں ہے

اے خدائے عرش و فرش و خاک و آب
تو نے ہم کو نعمتیں دیں بے حساب

غم بھی دے ملت کا غمخواری بھی دے
دل کو اک احساسِ خودداری بھی دے

راستی کی دولتِ بیدار دے
عزمِ محکم قوتِ ایثار دے

نیکیوں کا جذبۂ خاموش بھی
امتیازِ نیک و بد کا ہوش بھی

ذوقِ محنت حق پرستی سادگی
شر سے نفرت خیر پہ آمادگی

دل سے بہتر فطرتِ دل چاہیے
قوم کی خدمت کے قابل چاہیے

سر پہ آنکھوں پہ یہ فانی زندگی
اور دے اک جاودانی زندگی

رحم کر ہر قوم کے انسان پہ
ابر رحمت بھیج ہندوستان پہ

جستجو

یہ اہلِ جستجو کچھ سعی کا حاصل نہ پائیں گے
یہ احساسِ عمل یہ جذبۂ کامل نہ پائیں گے

کہیں اس شان سے ربطِ دماغ و دل نہ پائیں گے
دلیلِ راہ جب تک ہم نہ ہوں منزل نہ پائیں گے

مسافر دھن کے پکے ہوں تو خود بھرتی ہے دم منزل
جہاں چاہیں گے ہم آجائے گی زیرِ قدم منزل

صداقت داد خود داری دل صبر آزما ہوگی
ہوائے انقلابی پردۂ غفلت اٹھا دے گی

اقلیت کے آگے اکثریت سر جھکا دے گی
زمانہ خود پکارے گا ضرورت خود صدا دے گی

غمِ ہستی کے طوفاں میں ٹھہر سکتا نہیں کوئی
سہارا ہم نہ دیں جب تک ابھر سکتا نہیں کوئی

ادھر سے ہو کے بے پروا گزر سکتا نہیں کوئی
وہ ذرہ ہیں نظر انداز کر سکتا نہیں کوئی

منارہ قوم کی عظمت کا جب دولت بناتی ہے
بلندی پر انھیں ذروں کی طاقت مسکراتی ہے

سراپا درد ہے دنیا دوا ہم ہیں دعا ہم ہیں
سفینہ اور تلاطم جانتے ہیں ناخدا ہم ہیں

بقا کی سلطنت کے مستقل فرماں روا ہم ہیں
جہاں کی مشکلوں سے پوچھ لے مشکل کشا ہم ہیں

سکوں اے ہند تجھ میں آج ہوگا اور نہ کل ہوگا
ہمیں اٹھیں گے جب یہ عقدۂ دشوار حل ہوگا

(72)

یادگار

جو دُور ہیں نگاہ سے ان کا بھی پاس ہے
دنیا کو دیکھتا ہوں اب احساں شناس ہے

اس دور میں بدل گئے ارض و سما کے دن
گھر گھر منائے جاتے ہیں اہلِ وفا کے دن

نام آورانِ دہر کے ہیں یوم بے شمار
آج اس کی یادگار ہے کل اس کی یادگار

یہ اعترافِ خدمتِ دنیا و دیں نہ تھا
آوازِ یا حسینؑ سے پہلے کہیں نہ تھا

سوئے ہوئے زمین میں صدیوں کے بھی اٹھے
مردے بہت حسینؑ کے صدقے میں جی اٹھے

شاہزادۂ اکرم

تیرے غم میں ہے پریشاں زلفِ لیلائے اودھ
تو کہاں ہے یادگارِ مسند آرائے اودھ

تو بھی کھویا جستجو میں موت کے مفہوم کی
اے نشانی تاجدارِ بیکس و مظلوم کی

کس قدر بے رحم ہے یہ گردشِ تقدیر بھی
چھین لی جانِ اودھ کی آخری تصویر بھی

اشک تھا اک غم کا صورت گر سو وہ بھی اب نہیں
شمع تھی اک اس کے مدفن پر سو وہ بھی اب نہیں

زندگی کی آس تھی تجھ سے تجھے موت آ گئی
اے اودھ کے نور کلکتے کی ظلمت کھا گئی

تیرا ارماں تھا وطن کو تجھ کو ارمانِ وطن
کیسے غربت میں گزاری زندگی جانِ وطن

دل کو ڈھارس تھی کہ تو ہے آج تو بھی مٹ گیا
لکھنؤ کے لاڈلے اب لکھنؤ بھی مٹ گیا

انتزاعِ سلطنت اب تک دلوں کو شاق ہے
آج یہ سیلِ فنا سے آخری الحاق ہے

زخم کھایا تھا جو سن چھپن میں تازہ ہو گیا
آج اپنا جاں بلب ارماں جنازہ ہو گیا

آج تک پیشِ نظر ہے غم کا مارا کارواں
لکھنؤ سے کل سدھارا تھا ہمارا کارواں

مل گئے دل اس فریب چرخِ نیلی فام سے
تیری دولت لوٹ لی امن و سکوں کے نام سے

کھو گیا کل کا تمدن آج کی تہذیب بھی
خواب ہی دیکھا کیے تعمیر کے تخریب میں

پھر ابھر آیا وہ نقشِ ظلم قلب زار پر
موت نے پھر ماڑھ رکھ لی خنجرِ خونخوار پر

قابلِ صد ملک و ملت لائقِ صد تخت و تاج
شرمسار آنکھیں تجھے دیتی ہیں اشکوں کا خراج

گو لہو روتے تھے اپنا نقص ہمت دیکھ کر
پھر بھی اک تسکین سی ہوتی تھی صورت دیکھ کر

عمر بھر حاصل رہی بے تاج کی شاہی تجھے
صدر اپنا اپنا دل ملت نے سمجھا ہی تجھے

(74)

کوچ کا ڈنکا باجت ہے

جیل کی سدھ بسرائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے
اب تک موج نہ آئی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے
جیل کی سدھ بسرائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے
سکھیوں میں ہے جینا مرنا ہلکی ہمری بات نہ کرنا
اٹھو پریم دوہائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے
جیل کی سدھ بسرائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے
سوچت سوچت عمر گزاری رین کٹھن ہے دن ہے بھاری
کب تک یہ چترائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت ہے
جیل کی سدھ بسرائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے
اب نہ چلے گا پیار کا منتر تم گھر میں ہم جیل کے اندر
جگ میں ہو نہ ہنسائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے
جیل کی سدھ بسرائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے
جگی کے پیغام سے اٹھو دین دھرم کے نام سے اٹھو
ایک نہیں سنوائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے
جیل کی سدھ بسرائی ساجن کوچ کا ڈنکا باجت
ہے

(75)

آؤ سہیلی جیل چلیں

ساجن ہمرے جائیں نہ جائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
سب دھندوں کو آگ لگائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
ساجن ہمرے جائیں نہ جائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
بی بی کے دکھ درد پہ واری جگی پیت قوم سنواری
ان کی بپلا کیوں نہ رچائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
ساجن ہمرے جائیں نہ جائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
کربل بن کی بھوکی پیاسی نقشہ جس کے گھر کی داسی
اس کی قید کے بل بل جائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
ساجن ہمرے جائیں نہ جائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
بجلی چمکے بادل گرجے سانچے بول سے دھرتی لرجے
گلیوں گلیوں شور مچائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
ساجن ہمرے جائیں نہ جائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
بجی کا اُپدیش سپھل ہو دھرم سپھل ہو دیش سپھل ہو
کاہے سکھین نیر بہائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
ساجن ہمرے جائیں نہ جائیں آؤ سہیلی جیل چلیں

(76)

قافلے سے بچھڑ جانے والوں کے نام

عذاب سجدۂ ناحق ہوا جبیں کے لیے
سرِ نیاز نے بوسے یہ کس زمیں کے لیے

قفس سے ہم بھی نکلنے کی آرزو کرتے
نہ ہوتی موت اگر آشیاں نشیں کے لیے

ستم ہے دوست کا، دادِ ستم بھی دینی ہے
اک اور کام بڑھایا دلِ حزیں کے لیے

ہنوز نشۂ شکرِ جفا ہے دم لیجیے
ابھی زبان چلتی ہے آفریں کے لیے

نہ کیجیے تذکرۂ احتمالِ ناکامی
یہ چھیڑ زہر ہے دیوانۂ یقیں کے لیے

وطن ہے مجّم کا مسکن ہے میرؔ و غالبؔ کا
یہ ارضِ تاجِ شرف بن گئی زمیں کے لیے

جیل میں اسیران تبرا کا خیر مقدم

ادب سے ہوگئیں خاموش زنجیروں کی جھنکاریں
قدم رکھا جو ہم نے کانپ اُٹھیں زنداں کی دیواریں

خدائے درد نے دل و نویدِ نیک نامی دی
جھکائی ظلم نے گردن حکومت نے سلامی دی

زبانِ عشق پر افسانۂ شانِ درود آیا
زمیں نے پاؤں چومے آسمانوں سے درود آیا

ہوا تھکی زبانوں پر صدائے یاعلی پا کے
چمن زارِ نجف تک لے گئی نغمے تولا کے

اُٹھے تعظیم کو بیتاب ذرّے مرحبا کہہ کر
گلوں نے اپنی خوشبو پیش کی صلِ علیٰ کہہ کر

نشانِ مہر نے تمرّا کے اِذن پیروی مانگا
شعاعِ فاضلِ طینت سے نورِ زندگی مانگا

تجلی کی یہ رو حیرت سے دیکھی چاند تاروں نے
بلائیں دور سے لے لیں فلک کے ماہ پاروں نے

اُسے کیا ہوش جو عشقِ شہیدِ کربلا رکھے
اسیرانِ محبت اپنی دھن میں تھے خدا رکھے

خیال آیا نہ دل میں اور نہ لب پر گھر کا نام آیا
تصور کے دھندلکے میں فقط زندانِ شام آیا

(78)

زندگی کا گیت

موت سو بار آئے خاطر میں نہ لانا چاہیے
مرتے مرتے زندگی کا گیت گانا چاہیے

جس طرح چاہیں زمانہ کو بدل دیں اہلِ دل
پست ہمت ہیں جنہیں اگلا زمانہ چاہیے

اپنی ہستی سے بھی کل بیگانگی ہوگی تو کیا
آج موجودات کو اپنا بنانا چاہیے

فرض ہے حفظِ مراتب عزتِ نفسِ حیات
موت سے دو اک قدم آگے ہی جانا چاہیے

زندگی یہ ہے جدھر ہم ہوں ہوا اُس رُخ کی ہو
کون کہتا ہے ہوا کے رخ پہ جانا چاہیے

یہ سکونِ دل کا عالم بیدلی سے کم نہیں
نجم بیٹھے کیا ہو کچھ طوفاں اُٹھانا چاہیے

(79)

دورِ حاضر

چلے گی تا کجا بادِ مخالف دورِ دوراں میں
کسی دن حق کا ہوگا ہاتھ باطل کے گریباں میں

بہت صیاد ابھی سیرِ گلستاں دیکھنے والے
رہا کرنا ہمیں جب آگ لگ جائے گلستاں میں

مرے نالے قفس سے تا چمن پرواز کرتے ہیں
قفس میں ہوں کھٹکتا ہوں مگر چشمِ نگہباں میں

تعجب کیا جو بل آجائے تیور پر اسیروں کے
کیا ہے قید جس نے پوچھئے کیوں آئے زنداں میں

کریں کیا زیست کا خوابِ پریشاں دیکھنے والے
یہ تم کو کس نے شامل کر دیا خوابِ پریشاں میں

مناسب ہیں یہی طعنے ہماری بے قراری پر
کبھی تم نے وفا کی ہو تو منھ ڈالو گریباں میں

جنابِ نجم یہ قیدِ ستم اور فکرِ آسائش
ابھی تک مبتلا ہے دل فریبِ ساز و ساماں میں

(80)

قومی شعراسے

ذرا اے ہمصفیرو دل کی دنیا دیکھنے آؤ — اُٹھا رکھا ہے ہم نے آج پردا دیکھنے آؤ
گذاری ہے ابھی تک عمر زندانِ خیالی میں — حقیقت میں قفس ہوتا ہے کیسا دیکھنے آؤ
دلِ شاعر تمنا بن گیا ہے سرفروشی کی — تمنا کس کو کہتے ہیں تمنا دیکھنے آؤ
وہاں چمکی سی ہوگی روشنی شمع تولا کی — اندھیرے میں محبت کا اُجالا دیکھنے آؤ
اُٹھو اور سیدِ سجادؔ کے قدموں پہ سر دیکھو — چلو اب ربطِ بیمار و مسیحا دیکھنے آؤ
سلاخوں ہی سے آکر جھانک لو ہم دردمندوں کو — تماشہ بن نہیں سکتے تماشا دیکھنے آؤ

(81)

جیل جاتے ہوئے

۱۵راپریل ۳۹ء

تڑپ اے روح بن جا شمع آزادی کا پروانہ — کہ زنداں بن چکا ہے کوثر آشاموں کا میخانہ
ہلا رکھا ہے تیرہ سو برس سے جس نے دنیا کو — یہ زندہ قوم پھر دہرانے والی ہے وہ افسانہ
نظر نیچی نہیں ہوتی قدم پیچھے نہیں ہٹتے — کہ ہم کو شاہِ مرداں سے ملی ہے شانِ مردانہ
ذرا دم کیوں نہ لے لرزہ براندام ہوتا ہے — حکومت سے یہ کہہ دو کر چکی اب رقصِ مستانہ

بدل دیتے ہیں ہم اے جمِ صورت نظمِ عالم کی
چھلک جاتا ہے صبر و ضبط کا جس وقت پیمانہ

(82)

پنتھ نارا کے دن کا

کس کی مایا سدا رہی ہے ریت گھروندا کے دن کا
من میں جگہ نہ پائی ٹھاکر تن پہ اجارا کے دن کا
رہو گے کب تک منھ کو موڑے نام بڑا اور درشن تھوڑے
دیس میں سب کا مرنا گزنا پھر یہ پریکھا کے دن کا
چلتی پھرتی چھاؤں ہے دنیا نیاؤ کرو انیاؤ کرو
کتنے دیکھے ایسے تماشے یہ بھی تماشا کے دن کا
ایشر کے انصاف نگر میں دیر سہی اندھیر نہیں
ست اوجیارا رہتے جگ تک مگر اوجالا کے دن کا
کرودھ کپٹ کا راج نہ ٹھہرے آج بچا تو کال گیا
سانس کہاں کی آس کہاں کی سانس کا ڈھرّا کے دن کا
رنگ بھی چوکھا آئے گا جب سنی شیعہ ایک ہوئے
کے دن کی ہے مدح صحابہ اور تبرّا کے دن کا
نجمی گیت سنائے جاؤ اپنی دھن میں گائے جاؤ
جگ جیون ہے پریم کی ہنسی پنتھ نقارا کے دن کا

(83)

قیدی کا راگ

سُن قیدی کا راگ پریمی چھن بولت ہے زنجیر
سوئے گا کب تک جاگ پریمی چھن بولت ہے زنجیر
سُن قیدی کا راگ پریمی چھن بولت ہے زنجیر

ڈنڈا سکھے بیڑی سکھے دھیرے دھیرے دیپک سُلگے
بھڑکے من کی آگ پریمی چھن بولت ہے زنجیر
سُن قیدی کا راگ پریمی چھن بولت ہے زنجیر

دُکھ کی ہنسی بڑی سُہانی اب تک تو نے قدر نہ جانی
اپنے اپنے بھاگ پریمی چھن بولت ہے زنجیر
سُن قیدی کا راگ پریمی چھن بولت ہے زنجیر

جگ جیل کی مایا دیکھے کمبل دیکھے تسلا دیکھے
بیٹھا جگ کو تیاگ پریمی چھن بولت ہے زنجیر
سُن قیدی کا راگ پریمی چھن بولت ہے زنجیر

○



نجم آفندی

1975